جہانِ غالب
14
Ga

جہانِ غالب

یادگار حکیم عبدالحمیدؒ

جلد: 7 شمارہ۔ 14

نگراں

پروفیسر شمیم حنفی

مدیر

ڈاکٹر عقیل احمد

غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی

جہانِ غالب

یادگار حکیم عبدالحمیدؒ

جلد:7 شمارہ:14 جون 2012 تا نومبر 2012ء

قیمت فی شمارہ:-/20 روپے

قیمت سالانہ:-/40 روپے

ڈاک سے: -/50 روپے

کمپوزنگ: بشریٰ بیگم

طابع و ناشر

ڈاکٹر عقیل احمد

سکریٹری: غالب اکیڈمی

بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی-110013

فون نمبر:9868221198, 24351098

ای میل:ghalibacademy@rediffmail.com

ویب سائٹ:www.ghalibacademy.org

پرنٹر، پبلشر ڈاکٹر عقیل احمد نے غالب اکیڈمی کی طرف سے ایم آر پرنٹرس 2816 گلی گڑھیا، دریا گنج، نئی دہلی سے چھپوا کر غالب اکیڈمی 168/1 بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی 13 سے شائع کیا۔ ایڈیٹر: عقیل احمد

فہرست

اس شمارے میں

جہان غالب کا چودھواں شمارہ حاضر خدمت ہے۔ اس سال فروری کے مہینے میں غالب کے یوم وفات اور غالب اکیڈمی کے یوم تاسیس کی مناسبت سے سہ روزہ پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ غالب کے زمان و مکاں کے عنوان سے ایک روز کا سیمینار بھی منعقد کیا گیا اس میں بہت ہی عمدہ تحقیقی مقالے پڑھے گئے۔ یہ شمارہ انھیں مقالوں پر مشتمل ہے۔ اس شمارے میں 9 مقالے پیش کئے جا رہے ہیں جو موضوع کے لحاظ سے تو مناسبت رکھتے ہیں لیکن سارے مقالے الگ الگ نوعیت کے ہیں۔

پہلا مقالہ پروفیسر قاضی افضال حسین صاحب کا ''نئے اسالیب اظہار کا عہد'' کے عنوان سے ہے جس میں انھوں نے ولی، درد، سودا، میر، ذوق، مومن، ظفر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ غالب اردو غزل کی کلاسکی روایت کا تنہا شاعر ہے جس نے اپنے لیے اس روایت کی وہ جہت منتخب کی جسے اردو کے بعض ممتاز اور صاحب ذوق نقاد سرے سے غزل کی روایت تسلیم ہی نہیں کرتے۔ یہ مقالہ خصوصی توجہ کا حامل ہے۔ دوسرا مقالہ ''غالب کے معاصر فارسی شعرا'' پروفیسر شریف حسین قاسمی کا ہے جس میں انھوں انیسویں صدی کے نصف اول میں لکھے جانے والے اردو اور فارسی ادب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عہد غالب کا فارسی ادب کیفیت و کمیت کے لحاظ سے کسی بھی طرح کم اہم نہیں ہے۔ تیسرا مقالہ ''غالب کے دو اہم پیش رو (میر اور ناسخ)'' پروفیسر قاضی جمال حسین صاحب کا ہے، اس مقالے میں میر اور ناسخ کی شعری روایت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ غالب سے پہلے ناسخ اور میر کی روایت اپنی انفرادیت اور استحکام کے سبب ہماری تاریخ کا نا قابل فراموش باب ہے۔ غالب ان دونوں روایتوں سے کسی نہ کسی سطح پر اپنا رستہ استوار کرتے ہیں۔

چوتھا مضمون ڈاکٹر ضمیر حسن دہلوی کا ''غالب کی دلی'' ہے جو نہایت دلچسپ دہلوی زبان کے

چٹخارے سے مزین ہے جس میں انیسویں صدی کی دلی کی جان دار تصویر پیش کی گئی ہے۔ پانچواں مضمون ڈاکٹر یونس جعفری کا ''کلام غالب میں فارسی روایت'' ہے۔

چھٹا مقالہ ڈاکٹر سید عبدالباری کا ''غالب اور ان کے لکھنوی ہم عصر'' کے عنوان سے شامل کیا گیا ہے۔ لکھنو اور دہلی شعرا کے حوالے سے ڈاکٹر سید عبدالباری لکھتے ہیں ''لکھنو میں شعرا کی ذہنی سطح دہلی میں غالب اور ان کے دہلوی معاصرین کے بالمقابل پست تھی عیش تھی، عیش وطرب کی مجموعی فضا نے شعرا کے مذاق کو پست کر دیا تھا۔''

پروفیسر علی احمد فاطمی کا مضمون ''غالب اور سیکولرزم'' کے عنوان سے شامل اشاعت ہے جو اپنے آپ میں منفرد ہے۔ اس میں غالب کے عہد کی تحریکات پر بحث کرتے ہوئے، غالب کو آزاد فطرت کا انسان بتاتا گیا ہے جسے مذہب سماج رسم ورواج وغیرہ کی پابندی منظور نہ تھی۔ ڈاکٹر خالد جاوید کا مقالہ ''غالب اور عہد غالب کا فکری منشور'' اس رسالے میں شامل ہے جس میں عہد غالب کے بین الاقوامی فکری منظرنامے پر بات کی گئی ہے جس میں مارکسی اور وجودی تحریکات بھی شامل ہیں۔ یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ غالب اپنے زمانے کی معاشی اخلاقی اور سماجی کروٹوں کو جزوی طور پر جذب کرنے کے اہل تھے۔ آخر میں جاوید رحمانی کا مقالہ ''غالب اور اٹھارہ سوستاون'' شامل کیا گیا، مضمون کا آغاز یادگار غالب پر تبصرہ کے ساتھ کیا گیا ہے۔ آخر میں اکیڈمی کی سرگرمیوں کی روداد شامل کی گئی۔ امید ہے یہ شمارہ بھی پسند کیا جائے گا۔
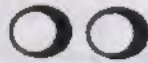
پروفیسر قاضی افضال حسین

نئے اسالیبِ اظہار کا عہد

کسی صنف سخن کی روایت کوئی جامد قائم بالذات کلیت وحدت نہیں ہوتی بلکہ ایک جاری عمل ہے۔ جس میں تخلیق کار اس صنف کے خاص اصولوں کی پابندی کے ساتھ متن مرتب کرتا اور اس عمل میں بڑا شاعر صنف کے اصولوں یا ذخائر میں نئی جہتوں کا اضافہ کرتا ہے، گویا اپنی روایت سے تخلیق کار کا ربط کبھی صنفی روایت کی پابندی تک محدود ہوتا ہے اور کبھی ایک قوی تر تخلیقی وجدان کے حامل شاعر کے یہاں اس تعلق کی نوعیت جدلیاتی ہوتی ہے یعنی وہ متن تو شعر کی روایت سے برآمد ہونے والے اصولوں کی روشنی میں مرتب کرتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی اس کا متن اس روایت میں نئی جہتوں کا اضافہ بھی کرتا ہے اور اس طرح اس صنف کے اصولوں میں ترمیم واضافے کے ذریعہ ان کے نئے معیار مرتب کرتا ہے۔

مزید یہ کہ روایت لازماً یک رخی نہیں ہوتی یعنی ایک صنف کی روایت میں تنوع اور ہمہ جہتی کے اتنے پہلو ہوتے ہیں کہ بعد کے شعرا ان میں سے اپنے لیے اپنا معانی خود منتخب کر سکتے ہیں بلکہ اکثر ذہین فنکار کرتے ہی ہیں۔ اس اخذ واستفادہ کی انتہائی صورت تو یہ ہے کہ ایک غیر معمولی تخلیقی فنکار اپنا معانی خود تشکیل دیتا اور اس عمل میں روایت کے خط وخال کو اپنے لیے از سر نو مرتب کرتا ہے۔

غالب اردو غزل کی کلاسیکی روایت میں وہ تنہا شاعر ہے جس نے اپنے لیے اس روایت کی وہ جہت منتخب کی جسے اردو کے بعض بہت ممتاز اور صاحب ذوق نقاد سرے سے غزل کی روایت تسلیم ہی نہیں کرتے۔ لیکن کسی صنف کی روایت کے ترک واختیار کا معاملہ اتنا سادہ بھی نہیں جتنا ابھی بیان کیا گیا۔ صنف کی روایت اپنی تشکیل کے زمانے میں ترک واختیار کے ایک طویل سلسلے سے گزرتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی ایک مستقل شناخت اور واضح اصول و نمیاز حاصل کر لیتی ہے۔

پھر دیر تک اس روایت کے تخلیقی تتبع کا زمانہ جاری رہتا ہے اور شعرا اپنی تخلیقی فطانت کی مناسبت سے اس روایت سے استفادہ اور کبھی کبھی اس میں نئی جہتوں کا اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ اردو میں ولیؔ، دردؔ، سوداؔ اور میرؔ اس مشاہدہ کی مثالیں ہیں۔ لیکن ایک قابل لحاظ زمانہ گزر جانے کے بعد یا تو خود اس صنفی روایت کی توانائی کمزور پڑنے لگتی ہے یا شعرا کے لیے اس روایت کے انجماد یا اضمحلال کے سبب کوئی فنی کارنامہ انجام دینا ممکن نہیں رہتا۔ صنف کی تاریخ میں یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب اس مضمحل پڑتی ہوئی روایت کے تتبع یا اس میں آرائشی اضافہ کرنے والے شعرا کے درمیان کوئی شاعر اس پوری روایت پر خط مستقیم کھینچ دیتا اور اپنے لیے صنف کی مختلف جہتوں میں وہ امتیازات تشکیل دیتا ہے، جو اس روایت میں تخلیقی اضافے کا حکم رکھتی ہیں۔ سبک ہندی کی روایت فارسی غزل میں ایسی ہی ایک تاریخی ضرورت سے نمو کرنے والی نئی جہت کی مثال ہے۔ سبک ہندی کی اصطلاح میں Signifier ہندی کی موجودگی کے سبب ہمارے ذہین ترین نقادوں نے اس طرز کو ایک خطۂ ارض کے مخصوص فکری اور علمی رجحان سے منسوب کردیا ہے اور یہ حقیقت بالکل نظرانداز کردی کہ فارسی میں غزل کی کلاسیکی روایت پر ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد اس نئے طرز کی بنیاد رکھی گئی کہ اب اس کلاسیکی روایت میں تخلیقی امکانات تقریباً Exhast ہو چکے تھے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ خصوصاً غزل کی روایت میں تبدیلی ترمیم یا اضافہ کا معاملہ جغرافیہ سے نہیں بلکہ صنف کی اس تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ جو اپنی تشکیل کے لیے اس شعریات کا پابند ہوتا ہے جو اس لسانی معاشرہ کے تصور کائنات وحیات سے برآمد ہوتا ہے۔

اس نظری اور قدرے پیچیدہ بحث سے قطع نظر اردو کی شعری روایت میں آرائشی اضافے کی مثالیں شاہ نصیرؔ، ناسخؔ اور ذوقؔ کی شاعری ہے۔ مومنؔ، ظفرؔ اور غالبؔ کے معاملات ان سے مختلف ہیں، لیکن ان شعرا کے تخلیقی طریق ہائے کار سے یہ تو بالکل واضح ہے کہ یہ اردو غزل کی شعری روایت میں تبدیلی اور اضافے کا عہد ہے۔ غزل کی صنف میں تخلیقی امکانت کی جستجو صاف دکھائی دیتی ہے اور یہ تمام شعرا اپنی تخلیقی صلاحیت کی حد تک نئے جہات دریافت / ایجاد کرتے دکھائی

دیتے ہیں۔ لیکن ان میں شاہ نصیر اور ذوق کی شاعری اس اختراعی قوت کی حامل نہیں جو اس روایت میں کسی نئی تخلیقی جہت کا اضافہ کر سکے۔ بلکہ یہ شعرا صنف کے اضمحلال کی اس فضا میں پرورش پائے ہوئے قاری کے ادبی ذوق کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کرتے ہیں جس میں کلام کا نیا پن زبان کی آرائشی سطح یا قادر الکلامی کی نمائش سے آگے نہیں جاتا۔ محمد حسین آزاد نے استاد ذوق کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ابتدا میں مرزا رفیع کا انداز تھا۔ شاہ نصیر سے ان دنوں معرکے ہو رہے تھے ان کا ڈھنگ وہی تھا اس لیے انہوں نے بھی وہی اختیار کیا۔ اس کے علاوہ مرزا کے طرز کو جلسے کے گرمانے اور لوگوں کے لب و دہن سے واہ واہ نکالنے میں عجب جادو کا اثر ہے۔ چنانچہ وہی مشکل طرحیں، چست بندشیں، برجستہ ترکیبیں، معانی کی بلندی الفاظ کی شکوہیں ان کے یہاں بھی پائی جاتی ہیں۔''

اس بیان میں سودا کے انداز کو اختیار کرنے کا جو سبب بیان کیا گیا ہے (جلسے کو گرمانے اور واہ واہ نکالنے کی صلاحیت) دراصل وہی زمانے کا رنگ اور ان شعرا کی تخلیقی کاوشوں کا محرک اصلی تھا۔ اس مقصد سے کئے گئے کلام کی تحسین کے لیے غور و فکر یا کلام میں معنی خیزی کے وسائل کی تلاش و جستجو کی ضرورت نہیں، ایک سطحیت، ایک یک رخا پن ہے کہ زبان سے نکلے اور محفل کو گرما دے۔ سامع شاعر کی قادر الکلامی اور بالکل سطح پر نظر آنے والے آرائشی اوصاف کی داد دے۔ ذوق کے مطلع:

تو جان ہے ہماری اور جان ہے تو سب کچھ ایمان کی کہیں گے ایمان ہے تو سب کچھ

شعر کی تعریف کرتے ہوئے ف صفیر بلگرامی لکھتے ہیں:

''جناب ذوق نے ایک مطلع تو ایسا لکھا ہے کہ جس کا جواب نہ ان سے ہو سکتا تھا نہ کسی اور سے ہوا اور نہ آئندہ ہوگا۔ وہ ممتنع الجواب ہے۔۔۔۔''یہ سب کچھ'' کا علاقہ سوائے ''جان'' و ''ایمان'' کے کسی کے ساتھ نہیں اور اس کو انہوں ختم کیا۔ اب کسی سے کیا

ہو سکے گا۔ (تذکرہ جلوۂ خضر ص۔ 231)

جہاں اتنی سامنے کی رعایت پر جان دی جا رہی ہو، وہاں شعر میں کسی معنویت یا الفاظ کے درمیان ارتباط سے نئے جہان معنی کی تشکیل کا سوال ہی کہاں اٹھتا ہے۔

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے بادشاہ ظفر کی اس مجبوری کا ذکر کیا ہے کہ ذوق کی شاگردی اور معاشرے کے ذوق کے سبب انہوں نے بھی وہی مقبول روش اختیار کی، جس میں معنی آفرینی یا الفاظ کے درمیان ظاہری کے بجائے حقیقی ربط کے لیے کوئی گنجائش نہ نکلتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود بہادر شاہ اپنے کمیاب تخلیقی لمحات میں ایسے اشعار لکھنے پر بھی قادر تھے، جن پر ماقبل کے دہلوی شعرا کے کیف اور داخلیت سے لبریز شعری اظہار کا اثر بہت نمایاں ہے:

پھرے ہے پارۂ دل، دیدۂ پر آب میں یوں	جلا کے چھوڑ دے، جیسے کوئی بھنور میں چراغ
میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں نگہبانوں کو	میری زنجیر کی جھنکار نے سونے نہ دیا
شمع ساں لگ اٹھے زبان کو آگ	گر کروں سوز دل بیاں اپنا
دیکھ تو ہجر کی شب کیونکہ ترے سوختہ جاں	شمع کی طرح سے رو رو کے سحر کرتے ہیں
جل جائے گی اے برق نہ ہو دیکھ مقابل	ہے سوختہ جانوں کا دم شعلہ فشاں اور

لیکن ظفر کو یہ حقیقی تخلیقی لمحات کم میسر آئے اور انہوں نے غالباً اپنی طبیعت کے خلاف اسی طرز کا تتبع کیا جو شاہ نصیؔر اور ذوقؔ کے کلام میں گرمیٔ محفل کا ذریعہ بنی ہوئی تھی۔

مومن خاں کا معاملہ اپنے ان معاصرین سے بہت حد تک مختلف تھا۔ ان کے مزاج کی نفاست اس اجتماعی روش کو قبول کرنے پر راضی نہ ہوئی اور انہوں نے عشق ومحبت کے روایتی مضامین کو انہیں روایتی رسوم ولفظیات کے ساتھ نظم کیا، جو ان کے نزدیک اردو غزل کی بنیادی روایت تھی۔ مومن نے اس روایت کو اس کے تمام رسوم وشرائط کے ساتھ قبول کیا۔ ان کے یہاں خاص نوع کا کلاسیکی فنی شعور بہت نمایاں ہے لیکن یہی ان کی تخلیقی حیثیت کی زنجیر بھی ہے کہ انہوں نے اس روایت میں کسی نئی جہت کی جستجو ہی نہیں کی۔

شیخ ناسخ ان مذکورہ تمام شعرا سے اس اعتبار سے مختلف بلکہ ممتاز تھے کہ انہوں نے اپنے لیے تجرید وتعقل کا وہ اسلوب منتخب بلکہ ایجاد کیا۔ جس کی طرف ان سے پہلے بہت کم شعراء کی نظر گئی۔ ناسخ کے کلام میں مناسبتیں اور صنعتیں اتنی ہی سامنے کی اور یک سمتی ہیں جتنی اس زمانے کے بیشتر شعرا میں مقبول تھیں، لیکن اظہار کے تجریدی اور تمثیلی انداز نے بہرحال ایک نئے طرز کی بناڈالی۔ تشبیہ اور تمثیل کا فرق تخلیقی اور منطقی یا تعقلی ربط کا فرق ہے۔ شاعر جب کوئی استعارہ (جس کی بنیاد بیشتر تشبیہ پر ہوتی ہے) نظم کرتا ہے تو یہ مستعارلیہ (Signifier) متن میں امکان کی ایک سے زیادہ جہتیں کھولتا ہے اپنی اس صفت کے سبب متن میں معنی خیزی کا امکان کھلتا ہے لیکن تمثیل میں مقدمہ اور مثال کا رشتہ تعقلی / منطقی یک سمتی اور متعین ہوتا ہے اس لیے مثال میں مقدمے کی مصداق ایک خوشگوار حیرت وتحسین کا تاثر پیدا کرتی ہے تو کیا متن کا تعقلی یا منطقی ربط تخلیقی ربط سے کوئی مختلف اور غزل کی شعریات میں کوئی کم تر درجے کی صفت ہے۔ یہ سوال پیچیدہ اور طویل بحث کا متقاضی ہے لیکن یہ تو بالکل واضح ہے کہ مرزا غالب نے اس تجریدی ومنطقی ربط میں بھی متخیلہ کی غیر معمولی قوت سے جو نیا معیار قائم کیا وہ صرف انہیں سے مخصوص ہے۔ اس سے تو اختلاف نہیں کہ یہ طرز خاص ناسخ اور غالب میں مشترک ہے لیکن ان میں درجے اور کیفیت (Quality) کا جو فرق ہے اور جس کی وجہ سے غالب کی شاعری حد درجہ معنی خیز اور ہمہ جہت معلوم ہوتی ہے، وہ ناسخ یا ان کے دوسرے معاصرین کی نہیں اور اس کی وجہ متخیلہ کی وہی قوت ہے جس کی تحسین کے ساتھ غالب کے متعلق اقبال کی نظم شروع ہوتی ہے:۔

فکر انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا!　　ہے پر مرغ تخیل کی رسائی تا کجا

مرزا کی نو دریافت ''بیاض'' نے ان کی شاعری کے محرکات کے متعلق قائم کردہ تمام مقدمات و قیاسات کی تردید کردی ہے۔ ایک خیال کے مطابق 19 برس کی عمر تک اور ایک دوسرے قیاس کے مطابق زیادہ سے زیادہ اکیس برس تک مکمل ہو چکی تھی۔ اس وقت تک نہ غالب کی انگریز افسران سے دوستی اور نہ ان سے انعام والقاب کی خواہش کا پتہ ملتا ہے اور نہ ہی غالب کلکتہ دیکھ کر

لوٹ چکے تھے اس نے تبدیل ہوتی ہوئی معاشی معاشرتی اور تہذیبی صورت حال کو کلام غالب کی خصوصیات کا محرک قرار دینے کا کوئی جواز نہیں۔ بنیادی بات وہی ہے کہ مرزا کی تخلیقی فطانت نے اپنی شعری روایت سے جو ماضی منتخب کیا۔ اس میں متخیلہ کا ہمہ جہت تحریک اور الفاظ کے درمیان ارتباط کے لیے علاقوں کی دریافت بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ اسے ہم خیال بندی اور مضمون آفرینی کی اصطلاحوں میں بیان کرتے ہیں۔ اگر یہ اصطلاحیں مرزا کے کلام کی غیر معمولی خصوصیات کا احاطہ کرتی ہیں تو اس میں کوئی حرج بھی نہیں۔ لیکن خود خیال بندی میں بھی کیفیت کی ایک سے زیادہ سطحیں ہیں، اس لئے کہ خود خیال کی پرواز ہر شاعر کے یہاں نہ ایک جیسی ہے اور نہ ان سے برتاؤ ہونے والے مضامین کی شعری اہمیت یکساں ہے۔ بلکہ خود غالب کے یہاں مقدمہ و مثال کے استدلالی تعلق میں بعض جگہ تقریباً اتنا ہی سامنے کا تعلق ہے جتنا شیخ ناسخ کے پورے کلام میں ہے۔

ہے گرفتاری نیرنگ تماشا ہستی　　بال طاؤس سے دل پائے بہ زنجیر آیا
دیکھ اس کے ساعد دست حنا آلودہ کو　　شاخ گل جلتی تھی مثل شمع، گل پروانہ تھا
عیب کا دریافت کرنا ہے ہنر مندی اسد　　نقص پر اپنے ہوا جو مطلع کامل ہوا
تنگ ظرفوں کا رتبہ جہد سے بہتر نہیں ہوتا　　حباب مے بصد بالیدگی، ساغر نہیں ہوتا

یہ تمثیلیں دراصل ایک صورت حال کی نئی تعبیریں ہیں جن کی ندرت شاعر کی قوت اختراع کا پتہ دیتی ہیں۔

لیکن جہاں کسی خیال یا مضمون کو نئے استعاروں یا الفاظ کے درمیان نئے روابط کے ذریعہ نظم کیا گیا ہے وہاں ''معنی آفرینی'' کی وہ صورت ہے کہ شعر کسی ایک حتمی معنی کی نثری منطق قبول نہیں کرتا۔ گیان چند جین نے نسخۂ حمیدیہ کی شرح ''تفسیر غالب'' میں کئی جگہ متن کی حتمی معنی کی تشکیل میں پیدا ہونے والی دقتوں کا ذکر کیا ہے۔ معنی یا تعبیر کی سطح کا تو ذکر ہی کیا۔ خود متن میں علامات اوقاف بدل دیجیے تو معنی کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ مثالوں سے مضمون طویل ہو جائے گا اس لیے صرف ایک ہی علامات اوقاف سے تبدیل ہو جانے والی صورت حال کا ذکر کرتا ہوں:

شعلۂ رخسارا تحیر سے تری رفتار کے　　خار شمع آئینہ آتش میں جوہر ہو گیا

اس کی شرح شروع کرتے ہوئے جین صاحب لکھتے ہیں:

''شعر کی دو قرائتیں ہو سکتی ہیں۔۔۔۔۔ پہلے موجودہ قرات پر غور کیجیے۔۔۔''

(اور پھر شرح بیان کی ہے) اور پھر لکھتے ہیں۔

''دوسرے مصرعہ میں خار شمع کو مبتدا اور جوہر کو خبر مانا جائے تو دوسرے مصرعہ کے معنی یہ ہوں گے کہ تیرے عکس سے آئینہ میں شمع جل گئی اور اس کا روشن دھاگا آگ کے بیچ خط جوہر پر معلوم ہونے لگا۔''

اور اس کے بعد پروفیسر جین مزید لکھتے ہیں:

''آسی نے دوسرے مصرعہ کی قرأت دوسری طرح کی ہے۔''

شعلہ رخسارا تحیر سے تری رفتار کے　　خار شمع آئینہ آتش میں جوہر ہو گیا

اب معنی یہ ہوں گے۔ اے شعلہ ورخسارا شمع نے تیری رفتار کو دیکھا اور وہ حیرت سے آئینہ ہوگئی۔ اس کا رخ آئینہ آتش معلوم ہوتا تھا جس میں اس کا دھاگا جوہر تھا۔ اس تشریح سے تحیر کے معنی کھل کر آتے ہیں لیکن ''آئینہ آتش'' عجب سی بات ہے۔ اس لیے میں سب سے پہلی قرأت اور تشریح کو ترجیح دوں گا حالانکہ اس میں یہ کمزوری رہتی ہے کہ تحیر کی وجہ سے جوہر خار شمع کیوں ہوا۔ تحیر کے بجائے عکس یا تمثال کے معنی کا کوئی لفظ زیادہ مناسب ہوتا۔''

اس بحث سے قطع نظر کہ غالب کی افتاد ہی میں یہ بات نہ تھی کہ وہ ہمہ جہتی پر ایک جہتی اور سادگی کو ترجیح دیتے اس لئے عکس یا تمثال کا سوال ہی کیا۔ توجہ طلب بات یہ کہ متن میں علامات اوقاف کی تبدیلی اور ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ لکھنے کے مشوروں کے باوجود، متن خط مستقیم کی نثری منطق قبول نہیں کرتا۔ شعر میں آتشِ شعلہ اور آئینہ میں، جو صفات مشترک ہیں ان کا تعین ''رخسار'' کے حوالے سے کریں تو یہ صفات، صفائی، روشنی، چمک اور حدت ہوں گی۔ 'رفتار' سے مخصوص تحرک Signifiers کے مشترک صفات کی دوسری جہت ہے۔ 'شعلہ رخسار' آئینہ کو آتش میں تبدیل کرتا اور پھر جوہر آئینہ کو اس آتش میں ایسے جلاتا ہے کہ اس پر خار شمع کا گمان ہوتا ہے۔ آئینہ

میں محبوب کا چہرہ، اپنی روشنی، سرخی حدت اور صفائی کے سبب شمع کی طرح روشن ہوگا اور جوہر آئینہ خار شمع معلوم ہوں گے جو حسن رفتار سے حیرت کے سبب مثل خار شمع جلتے ہیں آئینہ اور آتش کی مختلف شکلوں ۔شمع اور شعلہ۔ کے درمیان روشنی چمک حدت اور صفائی کے علاوہ تحرک کو شریک کرنے کے لیے غالب نے پہلے اسے محبوب کی ذات میں شامل کرلیا ہے تاکہ شعر کے الفاظ صفت اور کیفیت کی دونوں سطحوں پر باہم مربوط ہو جائیں۔اس لیے شعر کی یک سمتی اور منطقی شرا اول تو ممکن ہی نہیں اور اگر ہمیں اس پر اصرار ہی ہو تو متن کی جتنی تشریحیں کی جاسکیں۔سب شعر میں بہ یک وقت فعال ہوں گی۔

ایک شعر میں متن کے تمام الفاظ کا مختلف سطحوں پر یہ ہمہ جہت ارتباط، غالب کی تخلیقی فطانت کا بنیادی امتیاز ہے۔جس میں ان کا کوئی شریک نہیں۔ یہ نہیں کہ اردو میں ''معنی آفرینی'' صرف غالب سے مخصوص ہے لیکن جہاں دوسرے شعرا کے یہاں ''معنی آفرنی'' کے معنی نئے یا نازک معنی پیدا کرتا ہے، وہاں غالب کے کلام میں معنی آفرینی الفاظ کے درمیان ارتباط کے لیے علاقوں کی دریافت اور مزید یہ کہ اس لیے اور انوکھے ربط میں بھی صفت اور کیفیت کی سطح پر بہ یک وقت کئی جہتوں میں فعال تعلق صرف غالب سے مخصوص ہے۔ اس لیے ہم ایک ہی نوع کے شعرا کی ایسی کوئی فہرست نہیں بنا سکتے جس میں غالب کا نام دو چار اور شاعروں کے ساتھ شامل کیا جاسکے۔

غالب کی اس غیر معمولی تخلیقی قوت نے نہ صرف یہ کے مابعد کے شعرا کی تخلیقی روش بدل دی بلکہ خود اس صنف کی روایت کو از سر نو مرتب کرنے کے بیان کی کوئی نئی طرح ڈالی، جس کا اثر بعد کے شعرا نے قبول کیا۔ لیکن ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی شاعر کی تخلیقی فطانت (Gemions) نے مابعد کی شاعری میں اظہار و بیان کے تمام اصول بدل دیے ہوں اور اس کے ساتھ ہی اپنی شعری روایت کو نئی طرح مرتب کرنے کی ضرورت روشن کردی ہو۔

یہ امتیاز صرف غالب کا ہے کہ ہماری شعری روایت کے ماضی اور مستقبل دونوں پر اثر انداز ہوا۔

OO

شریف حسین قاسمی

غالبؔ کے معاصر فارسی شعرا

انیسویں صدی کا نصف اول غالبؔ کا دور ہے۔ یہ سیاسی شکست وریخت کا زمانہ بھی ہے۔ قلعۂ معلیٰ میں محصور مغل بادشاہ کھلی آنکھوں سے اپنا عبرت ناک انجام دیکھ رہے تھے۔ بالآخر 1857ء میں یہ نام نہاد حکومت بھی ختم ہوگئی۔ ہندوستان میں خاص طور پر فارسی زبان وادب بیشتر دربار سے وابستہ رہے۔ دربار ختم ہوگیا۔ فارسی زبان وادب کے تخلیقی سوتے بھی خشک ہونے لگے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک نظام زندگی میں جو ادبی ماحول اور روایات کوئی آٹھ صدیوں میں پروان چڑھی تھیں، ان کی جڑیں اتنی گہری ہو چکی تھیں کہ ان کا یک لخت نابود ہو جانا غیر قدرتی اور ناممکن تھا۔ یہ ادبی ماحول اور روایات مذہبی علاقائی اور لسانی تعصبات کے بغیر پھلی پھولی تھیں، ان کی ترویج اور استحکام میں سب نے طیب خاطر حصہ لیا تھا، اس لیے سب کو عزیز تھیں۔ اس وجہ سے حتمی بدلے ہوئے نامساعد حالات میں بھی یہ روایات کسی نہ کسی صورت میں جاری وساری رہیں۔ بیسویں صدی میں علامہ اقبال انہی روایات حسنہ کے امین کی حیثیت بھی رکھتے ہیں اور خاتم کی بھی۔

انیسویں صدی کے نصف اول یعنی عہد غالبؔ میں متعدد مغل ریاستوں کے صوبے داروں اور دیگر صاحبان اقتدار نے مرکزی حکومت سے اپنا تعلق عملاً توڑ لیا تھا اور وہ اپنے اپنے علاقوں میں آزاد اور مستقل حکمرانوں کی حیثیت سے حکومت کرنے لگے تھے۔ ان سب ہی فرمانرواؤں کا نظام حکومت مغلوں سے مختلف نہیں تھا۔ ان کے درباروں نے بھی مغلوں ہی کی طرح علم وادب کی سرپرستی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ نتیجتاً اس دور میں دہلی کے علاوہ رامپور، اودھ، حیدرآباد، بھوپال ملتان، لاہور، ٹونک، عظیم آباد، سندھ وغیرہ ایسے مراکز وجود میں آگئے تھے جہاں فارسی شعرا وادبا

کی سخاوتمندانہ سرپرستی کی جارہی تھی۔ فارسی کے حامی ان مراکز کی کثرت کی وجہ سے بھی فارسی ادب کو زندہ رہنے اور ایک حد تک پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔

مختلف مآخذ میں انیسویں صدی کے نصف اول کے لگ بھگ ایسے سو سے زیادہ فارسی شعرا و ادبا کے احوال و آثار سے متعلق اطلاعات محفوظ ہیں جو ہندوستان کے ان مختلف علاقوں میں مصروف کار تھے۔ اس دور کے تقریباً پچاس شعرا کے نام اور ان کے دواوین وکلیات کا ذکر معاصر مراجع میں نظر آتا ہے۔ ان میں بڑی تعداد ایسے شعرا کی ہے جو صاحب دیوان تھے۔ یہ دواوین خطی نسخوں کی شکل میں مختلف ہندوستانی اور بیرونی کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

غالبؔ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جارہا ہے اور آئندہ بھی لکھا جائے گا۔ اس وقت ان کا اجمالی ذکر بھی نہیں کرنا ہے۔ ان کی ادبی کاوشوں اور امتیازی منظوم تخلیقات کا دوسرے معاصر شعرا کے آثار سے مقابلہ بھی مقصود نہیں کہ اس میں بڑے خطرات مضمر ہیں۔ یہ کام اس لیے بھی مناسب و ممکن نہیں کہ ان کے بیشتر معاصر شعرا کا کلام خطی نسخوں کی شکل میں کتاب خانوں کی زینت اور عام وخاص صاحبان ذوق کے تفصیلی مطالعہ سے محروم ہے اور اس وجہ سے ان کے محاسن و معایب نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ اس لیے عہد غالبؔ کے چند فارسی شعرا اور ان کے کلام اور بعض ادبی مراکز کی فارسی شعروشاعری سے دلبستگی اور دلچسپی کے ایک اجمالی تعارف پر اکتفا کرنا ہے۔

خود دہلی میں مومن خاں مومنؔ (1268ھ / 2-1801ء)، امام بخش صہبائی (1274ھ/1807ء) اور مصطفیٰ خاں حسرتیؔ (1288ھ/1869ء) فارسی کے ایسے نامور شعرا ہیں، جن سے غالب کے نزدیکی مراسم تھے۔ ان تینوں شعرا کو فارسی شاعری میں اہم مقام حاصل ہے۔

مومنؔ کے بارے میں ان کے معاصرین کا خیال تھا کہ:

برجمیع اصناف سخن قادر بود۔۔۔ بہ قوتِ سخن وری مومن کمتر کسی برخاستہ و در ھر دو لفظ چندان دستگاھی نصیب او گشتہ بود کہ پارسیاں از آن خودیِ لگارند۔

یہی وہ مومنؔ ہیں جن کے اس شعر کے عوض

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

غالبؔ اپنا مکمل کلام انہیں پیش کرنے پر تیار تھے۔

اسی طرح غالباً مومنؔ اس دور کے وہ مابعد فارسی شاعر ہیں جنہوں نے اپنے دور کی استعماری طاقت کے خلاف نعرہ بلند کیا اور ہم وطنوں کو اس کے خلاف صف آرا ہونے کی دعوت دی۔

این عیسویان بہ لب رساندند جان من و جانِ آفرینش

تا چند بہ خواب ناز باشی فارغ زفغان آفرینش

مومن چدہ ہم زبان عرفی از بہر امان آفرینش

بر خیز کہ شور کفر برخاست ای فتنہ نشان آفرینش

مصطفیٰ خاں حسرتیؔ کا فن شعر میں یہ مرتبہ تھا کہ غالبؔ گویا انہیں دکھائے بغیر اپنی کوئی غزل دیوان میں شامل نہیں کرتے تھے:

غالبؔ بہ فن گفتگو نازد بدین ارزش کہ او نںوشت دردیوان غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد

مزید برآں، غالبؔ کا خیال تھا کہ حسرتیؔ نے غزل میں نئے نئے معنی و مضامین کی تلاش کا حق ادا کردیا ہے:

غالبؔ ز حسرتیؔ چہ سرایم کہ در غزل چون اوتلاش معنی ومضمون نکردہ کس

غالبؔ کا حسرتیؔ کے بارے میں یہ خیال محض پاس دوستی کا نتیجہ نہیں، حقیقت پرمبنی ہے۔

اسی طرح خود حسرتیؔ کا اپنی شاعری کے بارے میں یہ دعویٰ تھا کہ:

ای حسرتیؔ زفکرت وقاد خود بنظم رسم جدا ز طرز احبا نہادہ ای

صہبائیؔ دہلی میں غالبؔ کے وہ تیسرے معاصر ہیں جنہوں نے مفتی صدرالدین آزردہؔ اور غالبؔ کے فن شعر کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اوران کے کلام کی وجہ سے انہیں ایرانی شعرا کے پایے کے شعرا کی ہندوستان میں کمی محسوس نہیں ہوتی:

چو دیدم غالبؔ و آزردہ راز ہند صہبائی بہ خاطر ہیچ یاد از خاک ایرانم نمی آید

لیکن وہ خود فارسی کے ایسے عالم و فاضل ہیں، جن پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ ان کا فارسی دیوان بہت مختصر ہے لیکن فارسی گرامر، علوم ادبی و بلاغی، متعدد اہم فارسی کتابوں کی شرح، ادبی تنقید پر کتابیں، فارسی زبان وادب سے ان کی ماہرانہ آشنائی اور اس پر تسلط کا ثبوت ہیں۔ شاعری میں بہرحال وہ غالبؔ کی فوقیت کا اقرار کرتے ہیں:۔

طاقتِ ہم طرحی غالب ندارد طبع من

سندھ میں تالپور حاکم خاندان کے افراد خود ادبی ذوق رکھتے تھے، شاعر و ادیب تھے۔ اپنے دربار میں انہوں نے شعرا کی بڑی تعداد جمع کر رکھی تھی۔ میر صوبے دار خانؔ۔ مائل ٹھٹویؔ، میر کرم علی خاں کرمؔ۔ میر ناصر خان جعفریؔ وغیرہ سندھ میں فارسی شاعری کی شمع کو روشن رکھے ہوئے تھے۔ غزل اور دیگر اصناف سخن کے علاوہ یہاں شعرا نے خمسے بھی نظم کیے۔ جن کی فارسی شاعری کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت ہے۔ نواب غلام محمد خان لغاریؔ کے یہ دو شعر ملاحظہ فرمایئے۔

صبح شد جلوۂ رخسار توام یاد آمد شام شد زلف گرہ دار توام یاد آمد
دوش تیری بہ نشانی زکمانی بگذاشت ناوک غمزۂ خون خوار توام یاد آمد

حیدرآباد میں نظام کے دربار کے علاوہ فارسی زبان وادب کا سرپرست ایک اور دربار بھی تھا۔ یہ راجا چندو لعل شاداںؔ کا دربار تھا۔ یہ خود فارسی کے شاعر و ادیب تھے اور فارسی شعر وادب کی سرپرستی میں اپنے دیگر ہم عصروں سے زیادہ گرم جوش وسخی۔ غالبؔ کو بھی ان کے دربار سے ارتباط کا مشورہ دیا گیا تھا۔ مہاراجا فارسی میں قتیلؔ کے فن کی عظمت کے قائل تھے اور غالبؔ کو قتیلؔ سے خدائی بیر، اس لیے غالبؔ چندو لعل شاداںؔ سے دور رہے۔ راجا نے ذوقؔ کو بھی حیدرآباد آنے اور اپنے دربار سے وابستگی کی دعوت دی تھی، ذوقؔ دلی کے اوراق مصور کی گلیوں کوچوں کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوئے اور یہیں روکھی سوکھی کھا کر ٹھنڈا پانی پینے پر اکتفا کیا۔ شاداںؔ کا فارسی کلیات غزلیات، قصائد، مثنویات، رباعیات وغیرہ پر مشتمل ہے۔ شاداںؔ نے فارسی کے عظیم استاد شعرا سعدیؔ، حافظ، انوریؔ، مولانا رومؔ، سنائیؔ وغیرہ کی پیروی کی ہے۔ بیدلؔ کا کلام بھی شاداں کی توجہ کا

مرکز تھا۔ان کی کلیات کے مقدمے میں کلام کی دلچسپ خصوصیت کا ذکر ہوا ہے:

''در جمیع اشعار مطلقاً کلمۂ یاس و مضمون نکبت اساس متدرج بناشد و ہر چہ گفتہ شود مشتمل بر اظہار شادمانی شگون نیک و خوشحالی بہ اورراہ باشد واین التزام خیلی مناسب وشایان تخلص گرامی است''

جنوب ہند میں ایک دوسرے فارسی مرکز کا ذکر بیجا نہیں۔ یہ کرناٹک کے والا جاہی فرمانرواؤں کا دربار ہے۔ یہ خاندان گوپامئو کا تھا اور فارسی زبان وادب کا شیدائی۔انیسوی صدی میں والا جاہ پنجم نواب محمد غوث خاں (1800/1272/863/1209) کرناٹک کے حاکم تھے۔ یہ خود شاعر تھے اور اعظم تخلص کرتے تھے۔ انہوں نے فارسی شعرا کے دو تذکرے بھی تالیف کیے۔ ایک 'صبح وطن' اور دوسرا 'گلزار اعظم'۔ اس حاکم خاندان نے فارسی کی بے مثال سرپرستی کی۔ نواب محمد غوث اعظم نے اسی دور میں ایک مجلس مشاعرہ تشکیل دی۔ اس مجلس میں کوئی ستر شاعر حصہ لیتے تھے۔ جن کا ذکر سید مرتضیٰ بینش نے اپنے تذکرے واشارتِ بینش میں کیا ہے۔ یہ مجلس مشاعرہ ایک خاص مقام پر ہر ہفتے منعقد ہوتی۔ خود نواب صاحب اس میں شرکت کرتے۔ نواب صاحب کی اجازت کے بغیر کوئی بھی اس میں شرکت نہیں کر سکتا تھا۔ راقم و واقف اس کے حَکم تھے۔ خالص اس مجلس کے منشی تھے۔ مدعو شعرا اپنا کلام پڑھتے شعر کے محاسن ومعایب پر گفتگو ہوتی۔ اگر اختلاف حل نہ ہوتا تو نواب صاحب کی رائے مان لیتے تھے۔ بات ختم ہو جاتی تھی۔ مشاعرے کے بعد حاضرین مجلس کی کھانے پینے کی چیزوں سے خاطر مدارات کی جاتی تھی۔ بنیش نے اس مجلس مشاعرہ کو غزل سے تشبیہ دی ہے۔

گفتم غزل این بزم سخن راہ مثل　　ہر یک بنیش خوش است بی عیب وخلل
شد مطلع اواعظم و مقطع راقم　　واقف و قدرت، دو فرد چیدہ زغزل

مجلس مشاعرہ میں بے جا اور نامناسب اعتراضات کی اجازت نہیں تھی۔ مولوی محمد واصف نے اپنے تذکرے معدن الجواہر میں ناصر علی سرہندی پر اعتراضات کیے اور ان کے کلام کا مذاق اڑایا۔

نواب صاحب نے انہیں مجلس مشاعرہ سے باہر کر دیا اور اپنے تذکرہ گلزار اعظم میں واصف کے اعتراضات کا مدلل جواب دیا۔ جوہر بھی پہلی بار اس مجلس میں شریک ہوئے۔ اس کے بعد یہ مجلس مشاعرہ پھر کبھی منعقد نہیں ہوئی۔ لوگ انہیں مذاق میں جوہر زمرد قدم کہنے لگے۔ اعظم کے یہ شعر سماعت فرمائیے۔

آن قدر گریہ نمودم بہ فراقت جاناں حال جسم شدہ چون پیکر تصویر در آب

ہمچو فوارۂ سیماب نماید آہم بسکہ مہتاب بہر گوشہ بجوش است امشب

مولوی سراج الحق موجد کلکتے میں مقیم تھے۔ برطانوی حکومت نے انہیں قاضی القضاۃ کے عہدے پر قابض کیا تھا۔ یہ واقف کے شاگرد لیکن حزین کے پیروکار تھے۔ موجد کے چھوٹے بھائی باندہ کے مولوی محمد علی خاں کے کہنے پر غالبؔ کلکتے میں ان کے مزار پر گئے تھے۔ ان کا صرف ایک شعر سن لیجیے۔

نوری است بہ دل جلوہ نما بلکہ تو باشی شمعی است بہ کاشانۂ ما، بلکہ تو باشی

تراب علی خاں عیشیؔ: قاضی محمد صادق اخترؔ، سید مظفر علی اسیرؔ، مولانا پیر محمد اودھیؔ، محمد مقیمؔ، سدا سکھ شائقؔ، چودھری کوڑا ملؔ، لکھنو اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں فارسی شاعری کی شمع روشن کیے ہوئے تھے۔ بساون لعل شادان اور محمد آفی ٹونک میں تھے۔ غلام علی حسین نے اسی دور میں ڈھاکہ میں واقعۂ کربلا کو حملہ حسینی میں نظم کیا تھا۔

انیسوی صدی کے نصف اول میں ایرانی شعرا بھی برابر ہندوستان آتے رہے۔ آغا برشتہؔ، میرزا محمد خاں نصیبیؔ ایسے ہی شعرا ہیں۔ نصیبیؔ کو ایرانی بادشاہ، فتح علی شاہ قاچار نے فخر الشعرا کا خطاب دیا تھا۔ یہ غازی الدین حیدر کے دور حکومت میں لکھنو آ گئے تھے اور عیش و عشرت سے رہتے تھے۔

غالبؔ کے معاصرین میں چند ایسے فارسی شعرا بھی نظر آتے ہیں جن کا تعلق یورپ سے تھا۔ مرانسو گوڈیسن جرمن تھے۔ انہوں نے فارسی اور اردو میں دیوان یادگار چھوڑے جواب دستیاب نہیں۔ ان کی فارسی مثنوی ظفر الظفر میں 1857 کے واقعات نظم ہوئے ہیں۔ ان کی فارسی نثر، نظم سے پر تھی۔ اردو فارسی دواوین کے علاوہ ان کی متعدد تالیفات کے نام منابع میں محفوظ ہیں۔

پس از حمد حق باد نعت مسیح روان خامہ سازم بہ قصہ صحیح
بہ گیتی کسی نیست مثل فرنگ چہ از ترک و ایران داز روم و زنگ
ہمیں ملکۂ ماست شاہ بزرگ کہ بر فرق دارد کلاہ بزرگ

T.W.Beale انگریزی میں اپنی کتاب OrientalBiographical Dictionary کی وجہ سے ایک آشنا شخص ہیں۔ فارسی میں ان کی کتاب مفتاح التواریخ بھی ایک متعارف کتاب ہے۔اس میں بیلے نے اپنے بے شمار قطعات تاریخ درج کیے ہیں جوان کے ایک فارسی شاعر ہونے کا ثبوت ہیں۔

فارسی شعرا اب تک ترک حسیناؤں پر مرتے تھے۔ حافظ شیرازیؔ تو اپنے ترک محبوب کی نظر التفات کے بدلے بخارا و سمرقند اس کی جھولی میں ڈالنے کو تیار تھے ۔

اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل ما را بہ خال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

فیضیؔ کا دل بھی ایک چنچل ترک حسینہ نے تڑپا رکھا تھا۔

ای ترک غم زن کہ مقابل نشستہ ای در دیدہ ام خلیدہ و در دل نشستہ ای

لیکن انیسویں صدی میں جب ہمارے فارسی شعرا نے یورپ کے حسن کو گلی کوچوں میں چلتے پھرتے دیکھا تو وہ ترک حسینہ کو بھول گئے۔اب یورپ کا حسن ان کا منظور نظر تھا،اس معاملے میں شعرا کا کیا بھروسہ، غالب کا بھی یہی حال تھا۔شاہ تراب علی ترابؔ بھی انگریز محبوبہ کی زلف گرہ گیر میں قید تھے۔

دل بہ زلفش ندھی، قید فرنگ است تراب گویہ اعجاز مسیحی، صنم انگریز است

انیسویں صدی عیسوی کے نصف اول میں ایسا بھی پہلی بار ہوا کہ بعض شعرا نے باقاعدہ فارسی اور اردو میں دواوین مرتب کیے۔ بعض منظوم فارسی آثار کو اردو میں منتقل کیا گیا۔اسی طرح فارسی اور اردو کے ادبی رشتے مستحکم تر ہوئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ عہد غالبؔ کا فارسی ادب کیفیت وکمیت کے لحاظ سے کسی بھی طرح کم اہم نہیں۔

○○

قاضی جمال حسین

غالبؔ کے دو اہم پیش رو

(میرؔ اور ناسخؔ)

غزل کی تاریخ میں میرؔ، ناسخؔ، اور غالبؔ کی شاعری اپنے عہد ساز کارناموں اور منفرد اسلوب کے سبب، سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ تینوں رجحان ساز شاعروں نے، اظہار خیال کے جن وسائل سے کام لیا وہ اس درجہ منفرد اور نایاب تھے کہ لسانی اظہار کے ان اسالیب نے ایک روایت کی شکل اختیار کرلی۔ یہ اساتذہ فن اپنے عہد کے ادبی معاشرہ میں اس درجہ مقبول ہوئے کہ ان کا تتبع، مقبولیت کی ضمانت سمجھا گیا۔ یہ اپنے زمانے کے مسلم الثبوت اور باکمال اساتذہ فن تھے۔ غالبؔ کے متعلق یہ تصور کہ ان کا کلام مشکل ہونے کے سبب ناپسند کیا جاتا تھا اور لوگ انھیں مہمل گو سمجھتے تھے۔ کچھ زیادہ لائق اعتنا نہیں۔ مولوی عبدالقادر رامپوری یا بعض دوسرے اصحاب سے منسوب وہ واقعات جن سے مرزا کی عدم مقبولیت کا خیال ہوتا ہے۔ لطیفے یا معاصرانہ چشمک سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ مومنؔ کی وفات کے بعد اپنا فارسی اور اردو کلام ہمیشہ غالبؔ کو دکھاتے اور ان سے اصلاح لیتے تھے۔ شیفتہؔ گلشن بے خار میں مرزا کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''مضامین شعری را کماحقہ، می فہمد بہ جمیع نکات ولطائف پے می برد۔ وایں فضیلتے ست کہ مخصوص خواص اہل سخن است۔ اگر طبع سخن شناس داری، بایں نکتہ رسی، چہ خوش فکر اگر چہ کمیاب ست، آیا خوش فہم کمیاب تر۔ خوشا حال کسے کہ از ہر دو شرف بے یافتہ وحظے ازبودہ۔''

شاعری کے سلسلہ میں خود غالبؔ کا مسلک بھی یہ تھا۔

ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نہ کرد

نہ صرف روشِ عام سے انحراف بلکہ پیش رووں کی طرز سے اِجتناب، غالبؔ کے نزدیک انفرادیت کی بنیادی شرط ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ تقلید اور پیروی سے شعوری گریز کے باوجود، پیش رووں کے باندھے ہوئے مضامین اور پیرایہ اظہار سے یک سر دست بردار ہونا ممکن بھی نہیں تھا۔ انحراف کی بنیاد پیش رو روایت پر ہی قائم ہوتی ہے، نئے مضامین اور نئے خیالات شاعری کے اسی سرمایہ سے برآمد ہوتے ہیں۔ جنھیں قدما، کسی نہ کسی انداز سے باندھ چکے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ تمامتر ندرت کے باوجود، شعرمعنی روایت کی پشت پناہی سے قائم ہوتے ہیں۔ بس دیکھنے کی بات یہ ہے کہ روایت میں موجود کن عناصر سے، غالبؔ کی تخلیقی حیثیت نے کسب فیض کیا اور انھیں اظہار کے کن نئے پیرایوں میں پیش کیا۔

غالبؔ کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کی غزلوں کا متعدد حصہ زود اثر سریع الفہم اور از دل خیزد، بردل ریزد والی شعریات سے علاقہ نہیں رکھتا۔ یہ غزلیں نہایت غور وفکر اور نکتہ رسی کا نتیجہ ہیں۔ غالبؔ کے کلام کے گرد تعقل اور دقیقہ سنجی کا ایسا صلہ ہے جو فی الفور شعر میں جملہ ممکنہ معانی تک رسائی میں حائل ہے اس وجہ سے حالی نے لکھا ہے۔

ہم کو مرزا کے عمدہ اشعار کو جانچنے کے لیے ایک جداگانہ معیار مقرر کرنا پڑے گا۔
جس کو امید ہے اہل انصاف تسلیم کریں گے'' (یادگار غالبؔ ص119)

یہ جداگانہ معیار یقیناً جذبے اور احساس کی شدت اور کیفیت پر انحصار کرنے والی شعریات سے مختلف ہوگا۔ مرزا کے اردو اور فارسی اشعار کی قرار واقعی تحسین، ایسے اصولوں کی روشنی میں ممکن ہے جنھیں محسوسات سے زیادہ، تصورات کی شاعری کے پیش نظر مرتب کیا گیا ہے۔ حواس اور مدرکات کا عالم انہی وسعتوں کے باوصف محدود ہے جبکہ عقل وخیال کی جولا نگاہ بے نہایت اور لامحدود ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایسے اشعار کی قدر کرنے والوں کا طبقہ یکسر تبدیل ہو جاتا ہے۔

اردو غزل کی تاریخ میں غالبؔ سے پہلے، محسوسات کی دنیا سے نکل کر فکر وسخن کے نئے منطقے دریافت کرنے کی نمایاں مثال امام بخش ناسخ کی ہے۔ ناسخ کی پیدائش 1185ھ

(مطابق 72-1771) ہے اس اعتبار سے غالبؔ (پیدائش 1212ھ) ناسخؔ سے عمر میں 27 برس چھوٹے تھے۔ غالب نے اپنے کئی خطوط میں ناسخؔ سے اپنے تعلق کا ذکر بھی کیا ہے۔ بعض خطوط سے اس بات کا بھی علم ہوتا ہے کہ ان کی ناسخؔ سے خط وکتابت بھی تھی۔ مہر کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''ناسخؔ مرحوم جو تمہارے استاد تھے میرے بھی دوست صادق الوداد تھے مگر یک فنے تھے صرف غزل کہتے تھے۔''

عبدالغفور نساخؔ کے نام ایک دوسرے خط میں، ناسخؔ کی غزلوں کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''شیخ امام بخش ناسخؔ طرز جدید کے موجد اور پرانی ناہموار روشوں کے ناسخ تھے''

غالبؔ نے ناسخؔ کو اپنے منتخب اردو دیوان کا ایک قلمی نسخہ بھی 26 ربیع الاول 1250ھ کو بھیجا تھا۔ ناسخؔ نے بھی اپنے دیوان کا ایک نسخہ غالبؔ کو بھیجا۔ غالبؔ کا مشہور زمانہ شعر ناسخؔ اور میرؔ دونوں کو بیک وقت خراج عقیدت ہے۔

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بہ قول ناسخؔ آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں

ناسخؔ کا مصرعہ غالبؔ نے اپنے شعر میں استعمال کیا ہے۔ ناسخؔ کا شعر یہ ہے۔

شبہ ناسخؔ نہیں کچھ میر کی استادی میں آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں

سادہ گوئی کے مقابلہ میں تازہ گوئی یا نازک خیالی کے طرز جدید کی روشنی کے سلسلہ میں حالیؔ نے یادگار غالبؔ میں یہ فکر انگیز نکتہ بھی بیان کیا ہے کہ

''یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ غالب نے سب سے پہلے یہ طرز اختیار کی تھی کیونکہ جس طرح کیمسٹری کے مدون ہونے اور علم کے درجے پر پہنچنے سے پہلے اس کے متفرق اصول مشرقی ملکوں میں بھی پائے جاتے تھے اسی طرح مرزا سے پہلے بھی بعض شعرا کے کلام میں اس نئی طرز کی کہیں کہیں جھلک سی نظر آجاتی

ہے۔" (ص 141 یادگارِ غالب)

حالی کے اس بیان کا مصداق امام بخش ناسخ کے علاوہ دوسرا کوئی شاعر ہوسکتا ہے مگر غالب سے پہلے خیال بندی کے طرز جدید کے جتنے عناصر ناسخ کے کلام میں یکجا ہو گئے ہیں کہیں اور نظر نہیں آتے۔

مصحفی نے اپنے دیوان ششم کے مقدمہ میں ناسخ کی شاعری کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے، اس سے بھی دہلوی شعرا کی سادہ گوئی کے برعکس خیالی مضامین اور دقیق معانی پر مشتمل ناسخ کی طرز جدید کی مقبولیت کا علم ہوتا ہے۔ مصحفی نے یہ مقدمہ 1224ھ میں تحریر کیا تھا جب غالب کی عمر محض بارہ برس تھی۔ مصحفی ناسخ کے متعلق لکھتے ہیں۔

"تخلص خودراسم با مسمیٰ انگاشتہ، برطرز ریختہ گویان سادہ کلام درعرصہ قلیل خط نسخ کشید سمند تیزگام خیال راز دائرہ چرخ بیروں برد۔"

مصحفی کا بیان ہے کہ اس طرز جدید کی مقبولیت کے سبب خود انھوں نے بھی اس نئی طرز کا تتبع کیا چھٹے دیوان کی اکثر غزلیں ناسخ کے طرز میں کہیں یہی اس وقت کی عام روش تھی۔

غالب نے ناسخ کی تازہ گوئی سے کس حد تک استفادہ کیا؟ اس پر اظہار خیال مقصود نہیں۔ البتہ تعقل پسندی، نئے مضامین کی تلاش اور دقیقہ سنجی وہ عناصر ہیں جو بلاشبہ ناسخ اور غالب کی غزلوں میں قدر مشترک ہیں۔

عبدالسلام ندوی نے شعرالہند میں شیخ ناسخ کے کلام کی ایک خصوصیت یہ بھی بیان کی ہے کہ وہ عموماً خیال بندی کرتے ہیں اور ان کی اکثر نازک خیالیاں کوہ کندن اور کاہ برآوردن کا مصداق ہوتی ہیں۔ نازک خیالی کی مثال میں عبدالسلام ندوی نے ناسخ کے دوشعر بھی درج کیے ہیں۔

دلچسپ اتفاق ہے کہ خود غالب نے بھی قاضی عبدالجمیل جنون کے نام اپنے ایک خط میں ،اپنے ایک شعر کے متعلق بعینہ یہی الفاظ استعمال کیے ہیں غالب کا مطلع ہے۔

قطرہ مے بس کہ حیرت سے نفس پرور ہوا   خط جام مے سراسر رشتہ گوہر ہوا

غالبؔ لکھتے ہیں کہ اس مطلع میں خیال ہے دقیق مگر کوہ کندن اور کاہ برآوردن یعنی، لطف زیادہ نہیں۔

عشقیہ مضامین کے بیان میں نرم، مدھم اور سریع الفہم الفاظ کے ذریعے عامۃ الورود تجربات کو بیان کرنے کے بجائے، خیالی مضامین کو دقیق اور پیچیدہ اسلوب میں اس طرح بیان کرنا کہ دل میں کوئی کیفیت پیدا کرنے کے بجائے شعر، ذہن کو مہمیز کردے، خیال بندی اور تازہ گوئی کی بنیادی شناخت ہے۔ یہی شناخت تفاوت درجات کے ساتھ غالبؔ اور ناسخؔ دونوں کے یہاں مشترک ہے۔

نئے مضامین کی تلاش میں یہ دونوں شاعر، لفظوں کے تلازمات سے خیال کو اس درجہ نازک اور معانی کو اتنا دقیق بنا دیتے ہیں کہ شعر کی تحریر کھولنے میں کافی غور وفکر سے کام لینا پڑتا ہے۔ مرزا عبدالقادر بیدلؔ جو فارسی میں سبک ہندی یا تازہ گوئی کے امام تصور کئے جاتے ہیں انھوں نے کلام کی پیچیدگی کو انسانی تجربے یا انسانی واردات کی مدد سے کھولنے کے بجائے خود متن کے تلازمات اور الفاظ کے باہمی رشتوں سے پیدا ہونے والے معانی کے ذریعے کھولنے کی بات نہایت دلکش اسلوب میں کہی ہے۔ اس طریقہ کار کو خیال بند شاعری کے مطلع کی کلید تصور کرنا چاہیے۔ بیدلؔ کا شعر۔

گرہ کشائے سخن در سخن بود بیدل بر ناخنے نہ فتد، کار لب کشودنہا

ناخن کے ذریعے، دھاگوں کی گرہ تو کھولی جاسکتی ہے لیکن، لب کشائی کا نازک کام ناخن سے نہیں لیا جا سکتا۔ سخن ور کی گرہیں تو خود متن کے اندر موجود، معنی خیزی کی صفت سے کھلتی ہیں۔ ناسخؔ نے بھی تقریباً یہی بات کہی ہے۔ اگرچہ بیدلؔ کے مقابلہ میں ناسخؔ کا اسلوب پست اور معیار کمتر ہے۔

ہے بیت ہی میں معنیٔ بیت خیال بند نزدیک ہے بہت جسے سمجھے ہیں دور ہے

ناسخؔ کے علاوہ غالبؔ کی پیش رو روایت میں سب سے بڑا پڑاؤ میر تقی میرؔ ہیں۔ میرؔ سے غالبؔ

کے استفادے کی صورت اور نوعیت کیا ہے؟ یہ ایک بحث طلب موضوع ہے۔تخلیقی سطح پر اخذ واستفادے کا مسئلہ اتنا تہ دار اور لطیف ہے کہ اس کی نشان دہی آسان بھی نہیں میرؔ سے غالبؔ کی عقیدت اور میرؔ کے فن کا اعتراف ایک کھلی حقیقت ہے۔ناسخؔ کے حوالے سے غالبؔ نے جو بات کہی ہے وہ غالبؔ کی عقیدت پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہے۔

آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں

غالبؔ کی مشہور غزل جس کا مطلع ہے۔

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا　　آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

عشقیہ تجربات پر مشتمل ہونے کے سبب قدرے سادہ اور سریع الفہم معلوم ہوتی ہے۔ لیکن غالبؔ کی نکتہ سنجی کا کوئی نہ کوئی پہلو اس غزل کے ہر شعر میں موجود ہے۔غزل کے مقطع میں اپنی استادی کا اظہار کرنے کے ساتھ ہی غالبؔ نے میر کے تئیں اپنی نیاز مندی کا بھی اعتراف کیا ہے۔

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ　　کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

غالبؔ میرؔ کی فنکاری اور استادی کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں۔یہ شعر بھی توجہ طلب ہے۔

میرؔ کے شعر کا احوال کہوں کیا غالبؔ　　جس کا دیوان کم از گلشن کشمیر نہیں

میرؔ نے اپنی تخلیقی صلاحیت اور تخیل کی بے پایانی کا جس ہنر مندی سے مظاہرہ کیا ہے اس کی مثال اسالیب اظہار میں فرق کے باوجود غالبؔ کے کلام میں دیکھنے کو ملتی ہے۔میرؔ کے کلام میں لفظوں کے معنوی انسلاکات جس طرح پھیلتے چلے جاتے ہیں تقریباً یہی صورت غالبؔ کے اشعار میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔میرؔ کے اشعار کی تہیں بھی دیر تک کھلتی چلی جاتی ہیں۔میرؔ کا شعر ہے۔

بے تامل کے شناسی طرز گفتار مرا　　دیدہ نازک کن کہ فہمی حرف تہ دار مرا

میرؔ کے اشعار کا حسن پہلی نظر میں اپنا گرویدہ تو بنا لیتا ہے لیکن شعر کے دیگر فنی محاسن اور معنوی انسلاکات، غور کرنے کے بعد دیر تک کھلتے چلے جاتے ہیں۔

لطف مجھ میں بھی ہیں ہزاروں میر دیدنی ہوں جو سوچ کر دیکھو

یہ بھی حقیقت ہے کہ غالب کے کلام میں فارسی تراکیب، استعاروں کی ندرت، اور مضامین تازہ کی تلاش انھیں میر کے حزنیہ آہنگ اور نرم لہجے سے بہت دور کردیتا ہے لیکن جو بات ان دونوں کو قریب لاتی ہے وہ اشعار کی تہ داری، تخیل کی قوت اور تجربے کی تنظیم ہے۔ غالب نے تخلیقی سطح پر میر سے جو استفادہ کیا وہ لفظیات، لہجہ یا خیال کی سطح پر نہیں تھا بلکہ دونوں سے ایسا عالم ایجاد کیا جو زمان ومکاں کے حصار سے آزاد ہے۔ الفاظ اپنی مخصوص ترتیب سے ایسا نگار خانہ تیار کردیتے ہیں کہ شاعرانہ خیال، کسی ایک فرد، ایک زمانے یا معاشرے کی روداد ہونے کے بجائے بنی نوع انسان کی سرگزشت معلوم ہوتے ہیں۔ کسب فیض کی یہ سطح، اتنی لطیف اور پیچیدہ ہے کہ عقل تجزیہ کار کی گرفت میں آسانی سے نہیں آتی۔ غالب کا خیال تھا کہ

''شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن۔''

میر نے بھی اپنے دیوان کے متعلق یہی پیش گوئی کی تھی کہ۔

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز تاحشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

ناصر کاظمی نے غالب کے سلسلے کو میر کی روایت سے جوڑتے ہوئے لکھا ہے کہ

''غالب بھی ایک ایسا شاعر ہے جس نے میر سے بڑی کاریگری سے اور کامیابی سے رنگ لیا اور ایک الگ جماعت بنائی بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ میر صاحب کا پہلا تخلیقی طالب علم غالب ہی ہے''(ص176 میر تقی میر: مرتبہ تحسین فراقی)

غالب سے پہلے ناسخ اور میر کی روایت اپنی انفرادیت اور استحکام کے سبب ہماری تاریخ کا ناقابل فراموش باب ہے۔ غالب ان دونوں روایتوں سے کسی نہ کسی سطح پر اپنا رشتہ استوار کرتے ہیں۔

سید ضمیر حسن دہلوی

غالب کی دلّی

انیسوی صدی کے شروع کا زمانہ ہے شاہ عالم از دہلی تا پالم، لال حویلی میں براجمان ہیں۔ اپنی جزرسی اور دکینوں کی خدمات شائستہ سے خزانے کی حالت انہوں نے خاصی سدھار لی ہے۔ تخت طاؤس بھی بنوالیا ہے۔ دنیا کی طرف سے آنکھیں موندے، دیکھی کو ان دیکھی کئے اور سنی کو ان سنی کئے صبر وشکر سے بیٹھے ہیں۔ قلعے میں جہاں پناہ کا دور دورہ ہے باہر نائب پیشوا کی باندھی بندھتی اور کھولی جاتی ت ہے۔ خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا اور حکم بائیوں کا ہے۔ دلی بھری پری اور شاد آباد دکھائی دیتی ہے۔ تخت اڑ گئے ہیں۔ بلندی رہ گئی ہے۔ ہاتھی لٹا لٹایا پھر بھی سوالاکھ کا۔ شاجہاں کی دلی کے آثار ابھی باقی ہیں۔ آسمان سے باتیں کرتے حویلیوں کے پھاٹک جن کے کواڑوں پر برنجی کنول میخیں ٹھکی ہیں۔ رتھ، بہلیاں، تانگے، منجھولیاں، ہوادار، تام جھام، پالکیاں، تخت رواں، سکھ پال، چنڈول، مہاڈول، نالکیاں ہاتھی گھوڑے، امیر امراء، بناؤ سنگھار کئے، مرقع بنے خدم حشم کے ساتھ، نقیبوں کی آواز، کڑکیوں کے کڑکے، چوبدار، سالار، آسے بردار۔ مرد ہے سب جوں کے توں سلامت ہیں۔ گلی کوچے بارونق، بازار کشادہ، سجے سجائے یوں کھچا کچھ بھرے ہیں کہ تھالی پھینکئے تو سروں پر چلی جائے۔ رات کو سواری نکلتی ہے تو مشالچی مشالیں لیے ایک ہاتھ میں مشال دوسرے میں تیل کی برنجی کپّی، تیل ٹپکاتے چلے جاتے ہیں۔ مشالوں کا دھواں اٹھتا ہے تو اپنی خوشبو سے فضا کو معطر کر دیتا ہے۔ کہاروں کی ہنکاروں، چوبداروں کی ہٹو بچو کی صداؤں سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ اس زمانے کی دلی وہ دلی ہے کہ ہر شخص اپنے آپ کو رستم، افراسیاب، جمشید اور کیقباد سمجھتا ہے۔ ناک چوٹی گرفتار دلی والیاں، باہر والوں پر ناک بھوں چڑھاتی ہیں۔ ایک ایک کے خاندان کے گڑے مردے اکھاڑے جاتے ہیں۔ نسلوں میں فی نکلتی ہے۔ سات پشتیں بنی جاتی ہیں۔ دلی کے توپڑوں کے امیروں میں ''نو دولتیا'' گالی کے مترادف ہے۔ کسی کو سمرقند کا زرگر،

کسی کو بخارے کا سقہ، کسی کو لونڈی بچہ کبھی نہ سچا، کسی کو قاردرہ دیکھنے والا، کسی کو گائن کا جنا، کہتے ہیں۔ غرض اپنی ٹکر کا کسی کو نہیں سمجھتے۔ لٹی کھٹی پالکیاں امیروں اور ان کے چیلوں کی نکلتی ہیں۔ غرض یہ کہ جدھر دیکھیے رونق ہی رونق دکھائی دیتی ہے۔ رنگینیاں بکھری پڑی ہیں۔ دن عید، رات شب برات معلوم ہوتی ہے۔

اس وقت مرزا نوشہ سات برس کا سن، گلبدن کی تنبان، چندیری کا ننھا سا جامہ، گوٹے کی ٹوپی، چمپا، ننھی جان، گوکھرد، کرن، کوٹی ٹکی اوڑھے، زردوزی کی کفش پہنے، پیاری صورت لئے اس دلی میں آن کے اپنی چچی کے میکے قاسم جان کی گلی میں اترے ہوں گے۔ ان کے ہم عمر بچوں نے جب مرزا کو اکبرآبادی لہجے میں باتیں کرتے سنا ہوگا تو کیسے ہنسے ہوں گے۔ کیسا انہیں بنایا ہوگا۔ دلی کا بچہ بچہ باہر والے کو ہیٹا سمجھتا تھا۔ اپنے رہن سہن، بات چیت، گفتگو، طور طریقے اور ناز نخرے میں آپ ہی آپ پکتا تھا۔ ذرا کسی کے منہ سے کوئی فقرہ غلط نکلا، بچے نے کھیلتے کھیلتے تو تکار کی یا اور کوئی بات خلاف وضع کی تو دلی کے بچے بھی برا مانتے تھے۔ سچ ہے مچھلی کے جائے کو تیرنا کون سکھائے۔ ان دنوں قلعہ تہذیب کا مرکز تھا اور بادشاہوں کی خوبو اس شہر کے رہنے والے چھوٹے بڑے امیر غریب سب میں سرایت کر گئی تھی۔ مرزا ان بچوں کے ساتھ آنکھ مچولی، چنی منی کا پہاڑ دا، سرنگ لال گھوڑی، کاٹھ کٹول، کوڑی جگن مگن، اندھا بھینسا، کوڑا جمال شاہی، چیل جھپٹا، چادر چھپول کھیلے ہوں گے۔ کچھ دن دلی میں رہ کر اور دہلی کی پیاری تہذیب و شائستگی کا رعب اپنے ننھے سے دل میں لے کر واپس ننہیال گئے ہوں گے۔

کچھ عرصے بعد مرزا کی شادی خانہ آبادی نواب الٰہی بخش معروف کی دختر نیک اختر سے ہوئی تو غالب اسی مکان میں دولہا بن کر آئے، شادی کر کے مرزا آگرہ چلے گئے اور پھر مستقل اقامت کے لیے دہلی آنا ہوا تو ان کی عمر بیس بائیس برس کی ہوگی۔ صورت دیکھنے دکھانے کے لائق تھی۔ کتابی چہرہ سبزہ رنگ، خوبصورت بتیسی، دانتوں پر مسی، دہرا بدن، کشیدہ قامت، اچھی ہاڑ، چوڑے دہے کی کلاہ پاپاخ، مشرد کا تنگ موری کا پاجامہ، جامہ دار چپکن اور اس پر نیم آستین، نوک دار کفش،

مرزا کی یہ وضع شہر آبادی تک رہی۔ ان کا دل آتے ہی دلی میں لگ گیا۔ مولوی امام بخش صہبائی، میاں نصیر الدین کالے صاحب، مفتی صدر الدین آزردہ، حکیم احسن اللہ خاں، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی صحبتیں میسر آئیں۔ دل شاد ہوگیا۔ دلی میں اب پہلی سی رونق تو نہ تھی۔ آل بابر کی عظمت وسطوت کے نشان روز بروز دھندلے ہوتے جاتے تھے۔ تاہم مغل عہد کے اس دور آخر میں دہلی کے اندر علماء، شعرا، ادباء کا ایک ایسا مجمع اکٹھا ہوگیا تھا۔ جسے دیکھ کر دربار اکبری کے نورتنوں اور عہد شاہجہاں کے جواہر پاروں کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ قلعہ اس وقت کی ادبی انجمن تھی۔ غالب بھی کبھی کسی نہ کسی تقریب میں وہاں ضرور گئے ہوں گے۔ اکبر شاہ ثانی تخت نشین تھے۔ شہر میں دور دورہ انگریزوں کا تھا۔ قلعے میں دربار بادشاہ کا اور شہر میں دربار صاحب کلاں کی کوٹھی پر لگتا تھا۔ اب خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا تھا۔ اس زمانے کی دلی کا یہ عالم تھا کہ سلطنت کو گھن لگ چکا تھا۔ اکبر شاہ ثانی چولہے آگ نہ گھڑے پانی'' بچے بچے کی زبان پر تھا۔ دیباو حریر کے پردوں میں ڈھکے جسموں کی حرارت مدھم پڑ چکی تھی مگر دلی والوں پر ایک گونہ بیخودی طاری تھی۔ وہ فکر فردا سے بے خبر ماضی میں کھوئے ہوئے زندگی کے رس کا آخری قطرہ نچوڑنے میں لگے ہوئے تھے۔ رزم کی سکت تو مدتوں پہلے ختم ہو چکی تھی۔ بزم ہی بزم رہ گئی تھی۔ اگلی دولت کی فراوانی نے پہلے ہی اس بزم آرائی کے خط وخال میں نفاست اور نزاکت بھر رکھی تھی اب اسی میں لذت اور عیش کا رنگ بھر کر دلی والوں نے اسے خود فراموشی کا بہانہ بنالیا تھا۔ اسی زمانے کے دلی کے لیے کہا گیا ہے کہ یہاں آٹھ دن نو میلے تھے۔ روز ایک نت نیا تہوار منایا جاتا۔ ہنسنے بولنے کے بہانے ڈھونڈے جاتے تھے۔ پیر فقیر کی نیاز نذر کے نام سے حلوے مانڈے اڑائے جاتے تھے۔ عرس، فاتحہ تک عقیدت مندی کا اظہار کم اور تفریح کا آلہ زیادہ بن گئے تھے۔ بیسیوں عرس ہوتے تھے۔ ہفتوں پہلے تیاریاں ہوتی تھیں۔ مزار کے آس پاس دکانیں سجتیں اور اکثر چراغاں وقندیلوں سے جنگل میں منگل منائے جاتے تھے۔ خلقت جس میں امیر غریب، مرد عورت، بوڑھے جوان سب ہی شامل تھے۔ کھنچ کر وہاں پہنچ جاتی تھی۔ امیر چھولداریاں لگواتے اور پڑوس کے مکان کرائے پر

لیتے تھے۔ بہتوں نے اسی مقصد کے لیے ذاتی مکانات مہرولی اور نظام الدین میں بنوار کھے تھے۔ غریب پیڑوں تلے ڈیرا جماتے تھے۔ کھانے پینے کا سامان لے جاتے تھے اور وہیں خاندان بھر کی بستی بسا لیتے تھے۔ مزاروں پر قوالیاں ہوتی تھیں۔ نذریں چڑھائی جاتیں، گلاب پاشی ہوتی، طوائفوں کے رقص ہوتے اور یاران زندہ دل جی بھر کر رنگ رلیاں مناتے تھے۔ یہ عرس اور میلے اس زمانے کے دلی والوں کو جان سے زیادہ عزیز تھے۔ معاشرے کے ٹوٹتے نشے کی کسلمندی دور کرنے کے لیے یہ چند جرعے صبوحی کی حیثیت رکھتے تھے۔ وارفتگی شوق نے مذہبی رسوم، موسمی تہواروں اور شادی غمی کو تقریبات کا بہانہ بنالیا تھا۔ رمضان، عید، شب برات، محرم، آخری شنبہ، بارہ وفات، گیارھویں شریف، خواجہ صاحب کی چھڑیاں، رجب کے کونڈے، بسنت، دسہرہ، دیوالی، ہولی، پنکھوں کا میلا، پھول والوں کی سیر، سب زور شور منائے جاتے تھے۔

اکبر شاہ ثانی کا انتقال رات کے دو بجے ہوا، خبر دار دم بدم کی خبر ولی عہد کو دے رہے تھے اور ولی عہد تاج اور لباس اور زیور کا خوان لئے بیٹھے تھے۔ انتظار اس کا تھا کہ میں کب سنوں کہ گھی کا کپا لنڈھ گیا۔ اور تخت شاہی پر جا بیٹھوں۔ چنانچہ ایک خبر دار نے خبر دی کہ حضور مبارک ہو مسافر گیا۔ بس فوراً ولی عہد بہادر نے شاہانہ لباس پہنا اور چاہا کہ تخت پر قدم رکھیں جو نجومیوں اور جیوتشیوں نے کہا کہ وقت اچھا نہیں ہے۔ سورج نکلے جلوس فرمائیے گا۔ اندھیرے میں تخت پر بیٹھنا نحس ہے۔ ولی عہد نے کہا میرے لیے نحس ہے یا رعایا کے لیے۔ نجومی کہنا تو یہ چاہتے تھے کہ دونوں کے لیے برا ہے مگر ولی عہد کے ڈر سے کہہ دیا کہ حضور رعیت کے لیے اچھا نہیں۔ ولی عہد نے کہا خیر دیکھا جائے گا۔ آفتاب نہ ہوگا تو کیا روشنی نہ ہوگی اور مشعل دستیاب اور شمع و چراغ کی ایسی روشنی ہوئی کہ دن نے مات کھائی۔ ولی عہد تخت پر بیٹھے۔ ابوظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ ثانی لقب اختیار کیا۔ ان کے تخت پر بیٹھتے ہی کال پڑا۔ سارا ہندوستان تراہ تراہ پکارنے لگا۔ آگرے کی طرف سے گیہوں ناؤ میں بھرا ہوا کئی ہزار من آرہا تھا۔ جب ناویں لال قلعہ کے پاس کنارے پر لگیں۔ اس سے پہلے کہ اناج کی بوریاں کھاری باولی پہنچائی جاتیں کنگلوں اور بھوکوں نے لوٹ

لیں۔ دلی کی عورتوں میں اس کی بھی یادداشت بن گئی تھی۔ ایک سے دوسری کہتی بوا جب نادیں لٹی تھیں تو میں بارہ برس کی تھی۔ آخر یہ بے وقت کی تخت نشینی اپنا رنگ لائی اور شاہجہاں آباد کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ سلطنت اجڑ گئی۔ لال قلعے کا ڈھانچہ رہ گیا۔ نام ونمود کا پانی ملتان بہہ گیا۔

دلی والوں کے لاکھ برے دن آگئے تھے۔ مگر ان کے اخلاق، وضعداری، مہمان نوازی اور برتاؤ میں سرمو فرق نہیں آیا تھا۔ اس راز کو وہی سمجھ سکتا ہے جس کی قسمت کا ستارا بام فلک سے یکبارگی ٹوٹا ہو۔ دور آخر میں جو یوروپین سیاح دلی آئے، انہوں نے اپنے سفرناموں میں اہل دلی کے اخلاق اور مہمان نوازی کا اعتراف کیا ہے۔ صاحب خانہ بڑی تعظیم وتکریم سے مہمان کو دیوان خانے میں جو زنانہ مکان سے علیحدہ ہوتا تھا، لے جاتا اور پھر خادم یا وہ خود مہمان کے آگے عطر گلاب، پھلوں کی قاب، اور خشک میوے کی پلیٹ رکھتا تھا۔ بعد میں پان کی گلوریاں یا صرف الائچی پیش کی جاتی تھی۔ غدر کے ہنگامے تک دلی والوں نے شاہجہاں آباد کے تہذیبی ورثے کو سینے سے لگائے رکھا اور پرانی روایات کی آبیاری اپنے خون جگر سے کرتے رہے۔ اس زمانے میں رکھ رکھاؤ اور خاندان کی عزت وآبرو کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا۔ لوگ عہد کے پکے اور قول کے دھنی ہوتے تھے۔ جس نے جو کہہ دیا جو وضع اختیار کرلی اسے مرتے دم تک نبھانا لازم ہوجاتا تھا۔ بدمعاشوں کی زندگی کے بھی ضابطے اور اصول تھے۔ جرم اور شرافت ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ حلال خور، چمار، کنجڑے، قصائی، سب اپنے اپنے درجے میں شریف ہوتے تھے۔ دلی میں منتوں، مرادوں کا بڑا زور تھا۔ درگاہوں میں چلّے چڑھتے، مسجدوں میں طاق بھرے جاتے، بچوں کے گلوں میں اللہ آمین کے گنڈے ڈالے جاتے، جینے کے لیے طرح طرح کی منتیں مانی جاتی تھیں۔ کوئی شاہ مدار کے نام کی چوٹی رکھتا تھا۔ کسی کے کان میں بالی پڑی جاتی تھی اور کوئی حسنی فقیر بنتا تھا۔

عوام اور خواص کے مشاغل ڈنڈ، مگدر، بانک، بنوٹ، پنجہ کشی، تیراکی، شکرے، باز کا شکار، پتنگ بازی، مرغ بازی، کبوتر بازی، بلبل کی پالیاں، شطرنج، چوسر گنجفہ، سب دہلی کے انحطاطی دور میں جوں کے توں برقرار رہے بلکہ یوں سمجھئے کہ ان فنون پر عروج کا زمانہ یہی تھا۔ دلی والوں کے

پاس رہا ہی کیا تھا ایک یہی تو دولت تھی اسے کیونکر ہاتھ سے جانے دیتے ہر شخص اپنے تئیں کسی کمال میں یکتا بننے کی کوشش کرتا تھا۔ اس زمانے میں آدمی اپنے حسب نسب پیشہ اور مشغلے کے مطابق لباس پہنتا تھا۔ آج کی سی بات نہیں تھی کہ بے دیکھے ایک وردی پہنے پھرتا ہے، درباری اور بازاری لوگ لباس سے پہچانے جاتے تھے۔ عمر کا بھی لحاظ رکھا جاتا تھا، اگر جوان ہے تو ایک ایک ٹانکے پر جوانی برستی ہے۔ بوڑھا ہے تو پیری اور سادگی ٹپکتی ہے۔ بانکوں کا بانکپن، چھیلوں کا چھیلا پن، ملاؤں کی ملائی، پہلوانوں کی پہلوانی رزالوں کی رزالت اور شریفوں کی شرافت لباس سے بھانپ لی جاتی تھی۔ چھوٹے آدمی جس لباس اور وضع کو اختیار کر لیتے تھے اسے بھلے مانس چھوڑ دیتے تھے۔ اسی بنیاد پر غالب نے داڑھی رکھی تو سر منڈوا دیا تھا۔ دوپلڑی ٹوپیوں کا رواج تھا مگر چوگوشی، پنج گوشی مغلئی، تاجدار ٹوپیاں مغل بچے اور شریف زادے پہنتے تھے، قلعے میں آنے جانے والے بنارسی دوپٹہ اور گوٹے دار پگڑیاں پہنتے تھے۔ درباری جامہ بھی پہنا کرتے تھے۔ امرا چغہ اور سر پیچ استعمال کرتے تھے۔ ہندوؤں میں پہلے جامے کا دستور تھا پھر نیم جامہ اور الٹی چولی کے انگرکھے پہنے جانے لگے۔ علاوہ ازیں اچکن، قبا، مرزئی بھی استعمال ہوتے تھے۔ پاجامے تنگ مہری کے یا غرارے یا ایک برے ہوتے تھے۔ امرا سیٹھ ساہوکار رنگ برنگ کی شالوں سے کمر کسے رہتے تھے۔ محلے میں رہائشی مکان کچھ اس وضع کے ہوتے تھے کہ باہری حصے میں ڈیوڑھی اور دیوان خانہ ہوتا تھا اندرونی حصے میں دالان در دالان ہوتے تھے سامان رکھنے کے لیے بغلی کوٹھریاں ہوتی تھیں، صحن بہت بڑا اور عموماً کچا ہوتا تھا۔ کھاتے پیتے گھروں میں چھوٹا سا بغیچہ بھی ہوتا تھا۔ متوسط لوگوں کے گھروں میں کچھ نہیں تو بیری یا انار کے درخت ضرور ہوتے تھے۔ شہر محلوں میں بٹا ہوا تھا۔ محلے بہت گنجان آباد تھے۔ ان کی گلیاں کوچے تنگ، پیچدار اور زیادہ تر کچے ہوتے تھے۔ چراغ جلے گلیاں سنسان ہو جاتی تھیں۔ محلے والے اپنے محلے پر بڑا ناز کیا کرتے تھے، محلے کے غریب اور نادار لوگوں کا خیال کیا جاتا تھا۔ غرض ہر طرح کا رکھ رکھاؤ، بھاری بھرکم انداز، جینے کا حوصلہ اور سلیقہ اس زمانے کی دلی والوں میں، اپنی معاشی اور سیاسی بدحالی کے باوجود، پایا جاتا تھا اور لوگ باد

مخالف کی تندو تیز آندھیوں میں پگڑی سنبھالے ہوئے تھے۔

مروت، محبت، وضع دار، صلح و آشتی اور سلیقہ مندی کا یہ انداز فلک تفرقہ پرداز کو دیر تک نہ بھایا۔ سیاسی بساط تو پہلے ہی درہم برہم ہو چکی تھی اب مجلسی اور ثقافتی زندگی بھی تباہ ہو گئی۔ غالب کا یہ حال کہ ہڈی سے چمڑا لگا۔ کانوں سے بہرے، بوڑھے پھونس، یہ افراتفری اپنی آنکھوں سے دیکھا کئے۔ شہر کھدکھدا کر برابر ہو گیا۔ جو گھر حویلیاں اور محل سرائیں تھیں زمین بوس کر دی گئیں۔ جہاں دنیا اُمڈی پڑتی تھی اور چلنے کو راستہ نہ ملتا تھا۔ اب وہاں ہو کا میدان ہو گیا۔ ہر طرف کدال پھاوڑے بجتے تھے۔ عجیب ویرانی اور پریشانی کا عالم تھا۔ نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر دلی کا نام ونشان مٹ گیا۔ چن چن کے امرا اور شریف زادوں کو پھانسیاں دی گئیں۔ غالب کو مغلوں کی تہذیبی بساط الٹ جانے کا بڑا غم تھا۔ ہندوستان کی تاریخ میں وہ اسے ایک بڑا سانحہ سمجھتے تھے۔

مئی 1857 دو پہر دن چڑھے وہ فوج باغی میرٹھ سے دلی آئی تھی یا قہر الٰہی سروں پر نازل ہوا تھا۔ بقدر خصوصیت دلی ممتاز تھا۔ ورنہ سرتا سر قلمرو ہند میں فتنہ و تہہ بالا کا دروازہ باز تھا۔ انہدام مساکن و مساجد کا حال کیا گذارش کروں۔ بانی شہر کو ہرگز وہ اہتمام مکان بنانے میں نہ ہوگا۔ جواب والیان ملک کو ڈھانے میں ہے۔ اللہ اللہ قلعہ میں اکثر اور شہر میں بعض بعض وہ شاہجہانی عمارتیں ڈھائی گئی ہیں کہ کدال ٹوٹ ٹوٹ گئے بلکہ شہر میں تو ان آلات سے کام نہ نکلا سرنگیں کھودی گئیں، بارود بچھائے گئے اور مکانات سنگیں اڑا دئے گئے۔

غالب اگلے برس اس اجڑے دیار کی ایک ایک اینٹ کو حسرت سے دیکھتے رہے مرے ہوؤں کا ماتم کیا۔ بچھڑے ہوؤں کو یاد کر کے روئے۔ اپنی موت کی آپ دعائیں مانگیں۔ آخر تین اوپر ستر کی عمر میں انہیں اس بندی خانے سے رہائی کا حکم ملا اور وہ اپنے مولائے حقیقی سے جا ملے۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم

تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

ڈاکٹر یونس جعفری

کلام غالب میں فارسی روایات

اسلام سے قبل کی تاریخ ایران کا ایک اہم مأخذ شاہنامہ فردوسی کو تصور کیا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کتاب میں بیشتر واقعات افسانوں پر مبنی ہیں مگر اپنے عہد کی روایات کے مطابق فردوسی طوسی نے تاریخ کے موضوع کو جو بعض لوگوں کے لیے خشک وغیر دلچسپ بھی ہوسکتا ہے دلچسپ اور قابل توجہ بنا دیا ہے۔

اگر چہ بابر کے عہد سے جنگوں میں توپ کا استعمال شروع ہوگیا تھا لیکن اس کے باوجود شمشیر و تیر وسنان کی اہمیت کم نہیں ہوئی تھی۔ مغل بادشاہ اور ان کی اطاعت سے آزاد امرا جب تک حکومت کرتے رہے وہ اپنی سپاہ میں جوش و ولولہ پیدا کرنے کے لیے انہیں شاہنامہ خوانی کی ترغیب دیتے رہے چونکہ اس کتاب کو ایسی تاریخ سے تعبیر کیا جاتا تھا جو حقایق پر مبنی ہو چنانچہ اس کے بارے میں کہا جاتا تھا:

ہر آنکس کہ شاہنامہ خوانی کند اگر زن بود پہلوانی کند

(جو شخص بھی شاہنامہ پڑھے گا اگر چہ وہ عورت ہی کیوں نہ ہو پہلوانی کرنے لگے گا)

شاہنامے میں پیشدادی خاندان کے بادشاہ جمشید کا اہم کردار نظر آتا ہے۔ اس کے فرزند فریدون کے تین لڑکے تھے جن کے نام سلیم، تور اور ایرج تھے۔ اس نے اپنی تمام مملکت کو اس طرح تقسیم کیا کہ ایرج کے حصے میں ایران آیا اور توران کا علاقہ تور کو ملا۔ چونکہ ایرج کے حصے میں فریدون کی حکومت کا بہترین حصہ یعنی ایران آیا اور تور کو وہ علاقہ ملا جسے توران کہا جاتا ہے چنانچہ تور اور سلم کو اس پر حسد ہوا اسی لئے ان دونوں نے سازش کر کے اسے تہ تیغ کر دیا۔ ایرج کے

لڑکے منوچہر نے اپنے باپ کے خون کا بدلہ لیا اور خود فریدوں کی پوری مملکت کا بادشاہ بن گیا۔ چنانچہ اس وقت سے فرزندان ایرج وتور کے درمیان وہ ہی رقابت چلی آرہی ہے جو ہابیل اور قابیل کے بارے میں بتائی جاتی ہے اور یہ رقابت وچشمک آج تک موجود ہے۔ فارسی زبان بولنے والے خود کو فارس کہتے ہیں اور ترکی زبان بولنے والوں کو ترک کہا جاتا ہے۔ اہل فارس (فارسی زبان) لوگوں کو ہمیشہ یہ زعم رہا کہ ہم اہل زبان ہیں اسی لیے وہ شعر سادہ رواں زبان میں کہتے اور ترکی زبان فارسی گو شعرا کو خاطر میں نہیں لاتے اور ان کے کلام کو قابل اعتنا نہ گردانتے۔ مگر ترک بھی ہار ماننے والے نہیں تھے۔ وہ اپنے اشعار کو تشبیہ، استعارہ، کنایہ نیز دیگر اصناف سخن سے آراستہ کر کے بیان کرتے۔ فردوسی فارسی زبان تھا اس نے ایک ہی مثنوی نظم کی یعنی شاہنامہ مگر نظامی گنجوی اگر چہ ترکی زبان تھا وہ فردوسی سے کہیں آگے نکل گیا۔ اس نے پانچ مختلف موضوعات پر داستانیں فارسی میں نظم کیں جو خمسۂ نظامی کے نام سے جانی جاتی ہیں۔

میرزا غالب ترک تھے انہوں نے بھی اپنے اسلاف کے اسلوب کی روایت کو برقرار رکھا اور اسی انداز میں شاعری کی جو انہیں اپنے آباواجداد سے ورثے میں ملی تھی۔ آیئے اب ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے اسلاف کی فارسی روایات کو کس طرح برقرار رکھا۔ بطور مثال ہم ان کے اردو دیوان کے پہلے شعر کو دیکھتے ہیں، فرماتے ہیں:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

ساسانی دور میں یہ رواج تھا کہ جس وقت مجرم کو سزائے موت دی جاتی تو اس کو کاغذ کا پیراہن پہنا دیا جاتا۔ جس پر اس کی فرد جرم اور اس کی پاداش میں سزاے موت کا اعلان درج کرایا جاتا۔ یہاں یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ کیا کاغذ کو قطع و برید کر کے اس سے کرتا بنا کر مجرم کو پہنایا جا سکتا تھا؟ دراصل اس زمانے میں اس جھلی کو جو ہرن کی کھال کے نیچے ہوتی ہے بطور کاغذ اس لئے استعمال کیا جاتا تھا کہ اس پر کوئی داغ یا دھبہ نہیں ہوتا اور جو کچھ اس پر لکھا جاتا تھا اسے صاف کر لیا جاتا تھا۔ میرزا غالب نے اپنے ایک شعر میں اس کی جانب اشارہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں

رونے سے اور عشق میں بے باک ہوگئے دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہوگئے

یہاں پاک سے مراد نجاست سے نجات حاصل کرنا نہیں بلکہ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہمیں اس قدر دھویا گیا کہ ہمارا وجود ہی باقی نہ رہا۔ میرزا غالب نے یہاں فارسی محاورے پاک رفتن کو استعمال کیا ہے۔ یعنی اگر کپڑے کو اتنا دھویا جائے کہ اس کا رنگ بالکل ہی زائل ہوجائے تو کہیں گے کہ رنگش پاک رفت۔ قصہ پاک کرنا اردو زبان کا عام محاورہ ہے، جس سے یہ مراد لی جاتی ہے کہ جو بھی باہمی اختلاف تھا وہ پورے طور پر برطرف ہوا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ میرزا غالب نے اپنے اردو دیوان کے پہلے شعر کا مفہوم میرزا صائب تبریزی کے اس شعر سے اخذ کیا ہے:

صورت حال من از خامۂ نقاس بپرس نقش بیچارہ چہ داند کہ چسان صورت بست

(میری صورت حال نقاش کی قلم سے پوچھو، نقش بیچارہ کیا جانے اسے کیسے جمایا گیا)

صائب اگرچہ تمام عمر اصفہان میں ہی رہا مگر وہ اپنے آبائی وطن تبریز سے آج تک پہچانا جاتا ہے۔ صائب نسلاً ترک تھا اور میرزا غالب بھی۔ گویا میرزا غالب اس روایت پر قائم رہے کہ وہ فارسی کے ترک شاعر کی سخنوری سے استفادہ کریں۔

صائب تبریزی کا مندرجہ ذیل شعر ملاحظہ ہو:

چنان از فکر صائب شور افتادہ است در عالم کہ مرغان این سخن دارند باہم در گلستانہا

(صائب کے افکار سے عالم میں وہ شور بپا ہے کہ پرندے بھی گلستانوں اس کے بارے میں ہی گفتگو کرتے ہیں)

میرزا غالب نے اسی خیال کو اس طرح بیان کیا ہے:

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہوگئیں

امیر خسرو دہلوی بھی ترک تھے مگر انہوں نے شاعری ہمیشہ فارسی زبان میں ہی کی۔ موصوف کا شعر ملاحظہ ہو:

شبی کردم بہ بستاں نالۂ درد رہا کردند مرغان آشیا نہا

(ایک رات میں نے اس کرب سے آہ وزاری کہ پرندے آشیانوں سے پرواز کر گئے)

بظاہر میرزا صائب اور میرزا غالب دونوں نے ہی امیر خسرو کے مندرجہ بالا شعر سے استفادہ کیا اور اسی مضمون کو تبدیل کر کے اس طرح بیان کیا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

میرزا غالب کا مندرجہ ذیل شعر ملاحظہ ہو:

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں لیکن اب نقش ونگار طاق نسیاں ہو گئیں

اس شعر میں دو باتیں قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے پہلی یہ ہے کہ میرزا غالب نے جسے طاق نسیاں کہا ہے اسے ایران میں طاقچۂ بالا کہا جاتا ہے۔ ہندوستان میں حویلیوں کی طرز تعمیر ایرانی فن تعمیر کی ہی دین ہے۔ ہر حویلی کے صدر دالان مین بیچ کے طاق کی نمایاں حیثیت ہوتی ہے۔ جس کے دونوں طرف اسی سطح پر دائیں بائیں دو طاق بنے ہوتے ہیں اور ان کے اوپر مزید دو طاق اتنی بلندی پر بنائے جاتے ہیں کہ ان تک ہاتھ آسانی سے نہیں پہنچ سکتا۔ فرض کیجیے وہاں کوئی چیز احتیاط سے رکھ دی گئی، مگر کچھ دن بعد یہ بات رکھنے والے کے ذہن سے اتر گئی کہ وہ چیز وہاں کب اور کس لیے رکھی گئی تھی۔ میرزا غالب نے ایسے ہی طاق کو طاق نسیاں سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ امرا نیز دولت مند لوگ اپنے محلات اور باغات کی چار دیواری کی محرابوں میں گل و برگ کی نقاشی کراتے تھے تا کہ فصل خزاں میں جب پتہ پتہ اور بوٹہ بوٹہ زمین بوس ہو جائے تو وہ نقش ونگار وہاں بہار کا منظر پیش کر سکیں۔ ان نقوش کے رنگ پریدہ نشان اب بھی مقبرۂ ہمایوں اور مدرسۂ صفدر جنگ کے احاطے میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

میرزا غالب کا مندرجہ ذیل شعر ملاحظہ ہو:

سہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے

آج بھی ایران کے دیہات میں ایسے مکان نظر آتے ہیں جن کی چھتیں گنبدی شکل کی ہوتی ہیں۔ روشنی کی آمد اور ہوا کے گذر کے لیے گنبد میں سب سے اوپر دائرہ نما روشندان بنا دیا جاتا

ہے۔ دوپہر کے وقت جب آفتاب پورے اوج پر ہو اور اس کی تمازت قابل قبول نہ ہو تو اس پر سیاہ رنگ کا کمبل ڈال دیا جاتا ہے تاکہ اس کی روشنی اندرون خانہ داخل نہ ہو۔ میرزا نے مندرجہ بالا دستور کے پیش نظر خود کو سیہ گلیم کہا ہے۔

یہ موضوع بہت دلچسپ ہے کہ وہ ہندوستان میں پیدا ہوئے اسی ملک میں نشو و نما پائی اور اپنی عمر کا بیشتر حصہ دہلی میں ہی بسر کیا، لیکن وہ اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ وہ ایرانی النسل ہیں:

بود غالب عندلیبے از گلستان عجم　　من زغفلت طوطی ہندوستان نامیدمس

(غالب تو گلستان عجم کا بلبل تھا میں نے غفلت سے طوطی ہند کے نام سے یاد کیا)

عجم میں بھی وہ خود کو سرزمین توران سے وابستہ کرتے ہیں۔

غالب از خاک پاک تورانیم　　لاجرم در نسب فرہمندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی　　بہ سترگان قوم پیوندیم

(غالب ہم خاک پاک توران سے ہیں۔ اسی لیے ہمارا تعلق دانشمندوں کے نسب سے ہے۔ اپنی نسل کے اعتبار سے ہم ترک زادہ ہیں۔ اسی لئے ہماری وابستگی زورِ قوم سے ہے)

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ شعر گوئی میں وہ خود کو فارسی گو ترک شعرا کے ہم پلہ جانتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:

امروز من نظامی و خاقانیم بہ دہر　　دہلی زمن بہ گنجہ و شروان برابرست

(آج میں دنیا میں نظامی گنجوی و خاقانی شروانی ہوں۔ دہلی مجھ سے گنجہ و شروان کے برابر ہے)

اب ہم میرزا غالب کی ان نثری تصانیف کا ذکر کریں گے جن کے عنوانات کی وابستگی ایرانی تہذیب و روایات سے ہے۔ میرزا غالب نے اپنے منثور مجموعے کا نام پنج آہنگ رکھا اس نام کا انتخاب شاید انہوں نے خمسۂ نظامی کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا ہو۔

دستنبو: اسے دستنبویہ بھی کہتے ہیں۔ یہ کچری کی قبیل کا سنہری پھل ہوتا ہے (جیسے لکھنو کا خربوزہ) عہد قدیم میں اس کے گودے کو نکال کر اس کی جگہ عود عنبر و مشک سے اگر جیسا خمیر بھر دیا جاتا تھا۔ اسے سونگھنے کے لیے ہاتھ میں رکھا جاتا تھا۔ اس کا دوسرا نام شمامہ ہے۔

باغ دودر: شہر اصفہان میں آج بھی ایسے قدیم محلات اور باغ موجود ہیں جن میں داخل ہونے کے لیے صدر دروازے میں دو حصے بنا دیئے جاتے۔ ایک خواتین کی آمدورفت کے لیے اور دوسرا مردوں کے واسطے۔ دستک دینے کے لیے کواڑوں پر جو دستے لگے ہوئے ہوتے ہیں ان کی علامات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کونسا حصہ مردانہ ہے اور کونسا زنانہ۔ دونوں دستکوں کی آواز مختلف ہوتی جس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ آنے والا کون ہے، مرد یا عورت۔ چنانچہ اسی مناسبت سے دروازہ کھلتا ہے۔ اندرون باغ خواتین اپنے گرد قناتیں نصب کر کے اور مرد کھلے میدان میں رقص وسرور کی محافل آراستہ کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی مناسبت سے میرزا غالب نے اپنے ایک رسالے کا عنوان باغ دودر قائم کیا۔

مہر نیم روز: ساسانی دور حکومت ایرانی تاریخ کا ایسا سنہری عہد تصور کیا جاتا ہے جس کی تقلید کرنا ہندوستان میں مغل اور ایران میں شاہان صفوی کے لیے باعث فخر تھا۔ چنانچہ دونوں ملک کے بادشاہوں نے اپنے دربار اسی طرز پر آراستہ کیے اور خود کو جم جاہ، فریدون فر اور نوشیروان عادل کہنا باعث فخر جانا۔ مغل بادشاہ اکبر کے زمانے میں جو جنتری رواج پذیر ہوئی وہ دراصل ساسانی عہد کی ہی تقویم تھی۔

آفتاب پرستی ایران سے شروع ہوئی۔ اس زمانے میں معابد کی چھت بھی مساجد کے گنبدوں کی طرح بنائی جاتی اور اس کے وسط میں بالکل اوپر روشندان بنایا جاتا۔ جب دوپہر کے وقت سورج کی روشنی اس میں داخل ہوتی تو عبادت و نیایش کی جاتی۔ اس بنا پر میرزا غالب نے اپنے ایک رسالے کا نام مہر نیم روز رکھا۔

درفش کاویانی: اس کے بارے، میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جمشید بادشاہ کے عہد میں ضحاک نامی ظالم حکمراں کا ظہور ہوا۔ اس کے بازوؤں پر دو سانپ نکل آئے تھے۔ جنہیں وہ انسانی مغز کھلایا کرتا تھا۔ اس کے سپاہیوں نے کاوہ نامی لوہار کے گیراہ لڑکوں کو یکے بعد دیگر مار ڈالا۔ کاوہ نے ضحاک کے مظالم سے تنگ آکر اپنی چمڑے کی دھونکنی کو نیزے پر نصب کر کے گویا اس کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ جس میں ضحاک مارا گیا۔

ضحاک کو مارنے کے بعد جمشید کے فرزند کو تخت حکومت پر لایا گیا اور کاوہ کی اس دھونکنی کو شاہی نشان قرار دیا گیا۔ جس کو ہر آئندہ تخت نشین بادشاہ نے جواہرات سے آراستہ کیا۔ یہ درفش یا پرچم عربوں کی فتح ایران کے بعد بطور مال غنیمت عرب سپاہ کے ہاتھ آیا۔

لیکن موجودہ ایرانی محققین کی یہ رائے ہے کہ کاویان لفظ کوی یا کویان کی صفت ہے۔ جس کے معنی بادشاہ ہیں۔ اس اعتبار سے درفش کاویانی نشان شاہی یا شاہانہ نشان ہوا۔ یہ مربع سپر (شیلڈ) کی شکل کا چرمی پارچہ تھا، جس کے چاروں کونے نیم دایرہ شکل کے تھے۔ اسے نیزے پر نصب کیا گیا تھا اور اس کی نوک پر کلغی جیسی شام نصب تھی۔ یہ پرچم یا بیرق ہخامنشی اور ساسانی بادشاہوں کے عہد حکومت میں ایرانی لشکر کے پیش پیش رکھا جاتا تھا۔

سنہ 1831 عیسوی میں اٹلی کے شہر پمپائی میں جو زمین کاوی کی گئی تھی اس میں یونانی بادشاہ سکندر اور ایرانی فرمانروا داریوش سوم کی جنگ کا منظر سنگی سل پر نقوش تراش کر پیش کیا گیا ہے۔ یہ جنگ سنہ 223 قبل مسیح واقع ہوئی۔ جنگ کے اس منظر میں داریوش کو جنگی رتھ پر سوار دکھایا گیا ہے۔ اس کے پیچھے اس کا سپاہی ہاتھ میں بیرق لیے ہوئے نظر آتا ہے۔ اس پرچم میں مرصع چرمی پارچہ نیزے پر نصب دکھایا گیا ہے جس کے پیچھے کلغی نما شام بھی نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ درفش کاویانی کو اختر کاویانی بھی کہا جاتا تھا

○○

ڈاکٹر سید عبدالباری

غالب اور ان کے لکھنوی ہم عصر

غالب ایک ایسے عہد میں اپنی زندگی کے آخری دور سے گذر رہے تھے جب دہلی میں مغلیہ سلطنت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا دوسری طرف لکھنؤ میں آراستہ نوابین اودھ کی بزم عشرت کے آخری ایام تھے۔ غالب بے حد ذہین، بے حد حساس اور زمانہ شناس انسان تھے۔ ان کی زندگی کے ابتدائی ایام آگرہ میں گزرے جب وہ فارسی زبان کی تعلیم اور فارسی شعرا کے دواوین سے استفادہ میں غرق تھے مگر نانیہال کی خوشحال زندگی نے ان کے اندر خرابیاں بھی پیدا کردیں جو اس وقت کے مغل رؤسا کے اندر گھر کرگئی تھیں آگرہ سے دہلی آئے تو اپنے تمام ذہنی عوارض کو ساتھ لائے جن کے سبب ان کو بڑے صدمات سہنے پڑے۔ دہلی میں بقول ابن فرید مولانا فضل حق خیرآبادی وغیرہ کے خلوص نے احتساب ذات کی صلاحیت پیدا کردی اور ماضی کے پچھتاوے نے ملامت کی شکل اختیار کرلی۔ مگر شراب وقمار بازی کی عادت سے نجات نہ ملی۔ انہیں اپنی خامیوں کا احساس تھا اور اس کی خاطر سید غوث علی شاہ قلندر کے ہاں زینت المساجد ایک خوان کھانے کا لے کر تیسرے دن حاضر ہوتے۔ بقول ابن فرید یہ وہ جانی بوجھی سزا تھی جو غالب ایک قبیح لت کی وجہ سے خود کو دے رہے تھے اور اس آزار ذات کے ذریعے وہ اپنی خطا پر خود ہی محاکمہ کرنا چاہتے تھے۔ اس کے باوجود وہ غیر معمولی انانیت پرست تھے۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ وخود بیں ہیں کہ ہم الٹے پھر آئے درکعبہ اگر وا نہ ہوا

ہنگامہ زبونی ہمت ہے انفعال حاصل نہ کیجیے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

پھر یہ غزل جس میں پرشکوہ الفاظ اور پرانا نیت تیور انہیں ناسخ کے ساتھ کھڑا کردیتی ہے۔

بازیچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

انہیں اپنی خاندانی رفعت کا شدید احساس تھا اور خوش تھے کہ رئیس زادگان سرکار انگریزی میں شمار کیے جاتے ہیں لیکن حیرت ہے کہ یہی اپنی عزو شان کا علمبردار جب روزی روٹی میں تنگی کا اندیشہ ہوتا تو کلکٹر اور داروغہ تک کی خوشامد پر تیار ہو جاتا ہے۔ خلعت و اعزاز کے لیے انہوں نے ملکہ وکٹوریہ کی شان میں قصیدہ کہا اور عام مجسٹریٹوں تک کی خوشامد کی اگر چہ اس سے ان کو بہت کم حصول مقصد میں کامیابی ہوئی جس کا اظہار وہ بار بار کرتے ہیں۔

جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا　　وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیوں کر ہو

انہیں کے معاصر لکھنؤ میں استاد ناسخ جن سے غالب راہ و رسم رکھتے تھے اور جن کے کلام کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے بے حد خوددار انسان تھے۔ ان کا اخلاق معاصر شعرائے دہلی سے بلند تھا۔ مولانا عبدالسلام ندوی شعر الہند میں لکھتے ہیں کہ "ناسخ کی زندگی کا یہ واقعہ آب زریں سے لکھے جانے کے لائق ہے کہ انہیں غازی الدین حیدر نے اپنے وزیر آغا میر کے ذریعہ پیام بھیجا کہ دربار میں آکر قصیدہ پڑھیں تو ملک الشعرا کا خطاب دیا جائے گا۔ ناسخ نے آغا میر کو جواب دیا کہ مرزا سلیمان شکوہ جو دہلی سے لکھنو آکر تقریباً جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے بادشاہ ہو جائیں تو وہ خطاب دیں گے یا گورنمنٹ انگلش خطاب دے، ان کا خطاب لے کر کیا کروں گا"۔ پھر ناسخ کے کردار کی یہ صلاحیت ان کی آئندہ کی زندگی میں بھی نظر آتی ہے جب وہ اپنے محسنوں اور کرم فرماؤں کی خاطر جلاوطنی کی زندگی گزارنے اور طرح طرح کی ایذائیں برداشت کرنے پر آمادہ ہو گئے لیکن در غیر پر سجدہ نہ کیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناسخ نے جن اقدار اور اخلاقی اوصاف کا اپنے اشعار میں ذکر کیا ہے وہ صرف برائے بیت نہیں۔

لوگ دن رات جو دنیا سے سفر کرتے ہیں　　کوچہ کی بے خبروں کو یہ خبر کرتے ہیں
سیہ بختی میں کوئی کب کسی کا ساتھ دیتا ہے　　کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا انساں سے ہوتا ہے

ناسخ کو دو بار غریب الوطنی کا مزا چکھنا پڑا۔ انہوں نے الہ آباد کی خانقاہ دائرہ شاہ اجمل میں یہ دن بسر کیے۔ خانقاہ کا انتخاب ان کے ذوق کا غماز ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ صوفیا کی صحبت ان کو کس قدر عزیز تھی۔ غالب کا بھی اپنے عہد کے علماء اور بزرگوں سے گہرا رابطہ تھا۔ مگر یہ رابطہ محض علمی انداز کا تھا۔ اس سے ان

کے مشاغل مے نوشی پر کوئی اثر نہ پڑا البتہ اپنے عہد کے صوفیانہ اور فلسفیانہ رجحانات سے وہ بخوبی آگاہ تھے۔

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب　　　تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

زبان کی ثقالت اور علمی اصطلاحات کی بھرمار غالب اور ناسخ دونوں کے یہاں نظر آتی ہے۔

بے خطر یوں ہاتھ دوڑاتا ہوں زلف یار پر　　　دوڑتا ہے جس طرح ثعبان موسیٰ مار پر

دہلی میں قدیم علوم کی شمعیں سیاسی انقلاب کے سبب جھلملا رہی تھی مگر خانقاہیں اور مدارس اپنی خستہ حالی کے باوجود برقرار تھے۔ دہلی کالج سے کچھ نئے علوم کی روشنی ضرور پھوٹ رہی تھی لیکن لکھنو مکمل طور پر ابھی تک منطق حکمت طب اور علم کلام کی گرم بازاری کی زد میں تھا۔ اس کے واضح اثرات ناسخ کے کلام پر نظر آتے ہیں لیکن دوسری طرف ماحول فکر و خیال کی پستیوں کی طرف گرتا جا رہا تھا اور ناسخ بھی تشبیہوں اور استعاروں میں جب بال کی کھال نکالتے ہیں تو بقول مولانا عبدالحیٔ ان کی شاعری لفظی گورکھ دھندہ بن جاتی ہے۔ کبھی وہ ایسی رفعتوں پر نظر آتے ہیں۔

خاکساروں سے ملا کرتے ہیں جھک کر سر بلند　　　آسماں پیش زمیں بہر تواضع خم ہوا

آزاد ہیں قیود سے افتادہ گان خاک　　　اڑتا پھرا شجر سے جو برگ خزاں گرا

ناسخ اور غالب کے عہد میں لکھنو اور دہلی کے احوال میں بعد المشرقین تھا۔ لکھنو میں اگر چہ چراغ کی لو مدھم تھی مگر سیاسی احوال اتنے خراب نہ تھے کہ اس کا اثر عوام پر ہوتا۔ دوسرے لکھنو کے حکمرانوں کو اگر چہ یہ اندیشہ تھا کہ انگریز اقتدار پر مکمل قبضے کرنے کا اقدام جلد یا بہ دیر کر کے رہے گا مگر وہ اپنے ذہن پر اس خوف کا سایہ پڑنے نہیں دینا چاہتے تھے اور انتقال ذہنی کے لیے شب و روز ایسے مشاغل میں منہمک تھے جو آنے والے دنوں کے خدشات کو بھلا دینے میں مددگار ثابت ہوں بس انہیں فکر تھی تو یہ کہ اپنی بیگمات اور ورثہ کے لیے انگریزوں کے پاس اتنی خطیر رقم جمع کر دیں جس کا سود نسلاً بعد نسل ان کو مالی تنگ دستی سے محفوظ رکھ سکے۔ مگر اس کے برعکس دہلی کی حالت بے حد خستہ و خراب تھی اور یہاں شرفا اور بالائی طبقہ کی زندگی اجیرن ہوتی جا رہی تھی غالب بھی اس زمرہ میں شامل تھے تھوڑی بہت پنشن جو ملتی تھی یا بہادر شاہ ظفر سے جو کچھ حاصل ہو جاتا تھا

وہ بھی غدر کے بعد ختم ہوگیا۔ امرا کے عادات واطوار اور فضول خرچیوں کے سبب ان کی محدود آمدنی میں گزارا مشکل تھا اور مستقل قرض وادھار پر زندگی گزر رہی تھی۔ پھر جو خراب عادتیں ماضی سے چلی آرہی تھیں انہوں نے غالب کو تنگ دست بنا دیا تھا۔ محرومی و مایوسی کے مہیب سائے ان کے لیے عذاب بن گئے تھے جس کی جھلک ان کے کلام میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔

جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

بقول ابن فرید وہ ہمیشہ یہی محسوس کرتے رہے کہ وہ جو کوشش کریں گے اس میں ناکام رہیں گے اور ان سے ہمدردی کرنے والا بھی مبتلائے بلا ہوجائے گا۔ چنانچہ حالات کی سختی سے نجات کے لئے انہوں نے تخیل وتصور کی دنیا کا رخ کیا۔

ہوس گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا عجب آرام دیا بے پر وبالی مجھے

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں گوشہ میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

لکھنؤ میں شعرا کی ذہنی سطح دہلی میں غالب اور ان کے دہلوی معاصرین کے بالمقابل پست تھی عیش تھی، عیش وطرب کی مجموعی فضا نے شعرا کے مذاق کو پست کردیا تھا۔ رعایت لفظی اور عوامی ذوق کی خاطر آتش جیسے قلندر صفت شاعر ایسے اشعار بھی کہہ رہے تھے۔

ایسی اونچی بھی تو دیوار نہیں گھر کی ترے رات اندھیری کوئی آوے گی نہ برسات میں کیا

اور اسی نکر کے کچھ اشعار غالب کے یہاں بھی موجود ہیں۔

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے کہا جو اس نے مرے ہاتھ پاؤں داب تو دے

لیکن رعایت لفظی اور متعلقات حسن کے ساتھ وہ تصوف کے نکات اور اخلاقی تعلیمات بھی پیش کرتے ہیں۔ آتش کا یہ معرکۃ الآرا شعر بھلایا نہ جاسکے گا۔

یہ آرزو تھی تجھے گل کے رو برو کرتے ہم اور بلبل بے تاب گفتگو کرتے

ایسے بہت سے اشعار آتش وناسخ کے یہاں ملتے ہیں جو لکھنو کے بازاری انداز سخن سے جدا ہیں

مگر معاشرہ ایسے ہی اشعار پر کھل کر داد دیتا تھا جن کی شاگردان آتش و ناسخ کے یہاں بھرمار ہے۔

میر علی حسین حزیں — افشاں کے بارے تو بتاتے ہو دردسر — صندل کا بوجھ اٹھے گا تمہاری جبین سے

سراج الدین جنوں — یاد خال لب محبوب میں کی عمر بسر — ایک دانہ پہ رہا ہم کو توکل کیا کیا

میر دوست علی خلیل — کیا بہار میں جس نے بتایا جو لٹکا — گیا نہ زلف کا سودا ہزار سر پٹکا

غالب کے عہد میں ان کے لکھنوی ہم عصروں کے یہاں روایتی اور خیالی مضامین کی کثرت تھی، ناسخ مشکل پسندی کے شیدائی تھی ان کے بالمقابل دہلی میں غالب بقول شمس الرحمٰن فاروقی جدید انسان کی کسمپرسی کو ایک ایسی دنیا میں پناہ دیتے ہیں جو اس دنیا سے بہت قریب ہے جس کی یادیں جدید انسان کے اجتماعی لاشعور میں پوشیدہ ہیں۔

ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے — میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

غالب کے یہاں فاروقی کے الفاظ میں اشکال سے زیادہ ابہام ملتا ہے۔ الفاظ کی غیر قطعیت انسان کو کئی رخ پر سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔

زخم نے داد نہ دی تنگی دل کی یارب — تیر بھی سینۂ بسمل سے پر افشاں نکلا

غالب کے پیچ در پیچ استعاروں اور ہمہ جہت ابہام نے ان کے کلام میں معنوی وسعتوں کا ایک بحر ناپیدا کنار میں تبدیل کر دیا ہے جس کی کوئی مثال ان لکھنوی ہم عصروں کے یہاں نہیں ملتی۔ غالب کے یہاں لایعنی مضمون آرائی نہیں۔ وہ سادگی و اصلیت کا دامن نہیں چھوڑتے۔ چنانچہ فاروقی کے الفاظ میں ان کی پوری شاعری لکھنوکی پوری شاعری کی نفی کرتی ہے۔ وہ کبھی روایتی اور خیالی مضامین کے قریب نہیں جاتے اور اپنے پروقار اسلوب پر قائم رہتے ہیں۔ چنانچہ حالی جیسا نقاد جو شعر و قصائد کے ناپاک دفتر پر لعنت بھیجتا ہے اور غزل خوانی کو بے وقت کی راگنی قرار دیتا ہے غالب کا شیدائی ہے جن کا زیادہ تر کلام عقلی استدلال پر مبنی ہے۔ یہ سچ ہے کہ غالب کے مزاج میں علویت مزاج خودداری وقار رکھ رکھاؤ اور عظمت انسان کے پہلو موجود ہیں جو انہیں اپنے ہم عصروں سے منفرد و ممتاز بناتے ہیں۔ ان کے شروع کے دور کے کلام میں جب وہ بیدل

سے بے حد متاثر تھے مشکل پسندی اور پیچیدگی خیال کا قدم قدم پر اظہار ہوتا ہے پھر وہ صائب کے اتباع میں تمثیلی انداز کی طرف بھی مائل ہوتے ہیں جس کی بہ کثرت مثالیں لکھنوی شعرا بالخصوص ناسخ کے یہاں نظر آتی ہے مگر حقائق تک پہنچنے اور غور وفکر کی یہ روش آگے چل کر غالب کو اپنے عہد ہی نہیں موجودہ عہد کا ایک بلند سخنور بنا دیتی ہیں جس کے طرز فکر اور طرز اظہار کو متعدد بڑے فنکاروں نے اختیار کیا۔ احتجاج و بغاوت، طنز وتنقید ان کے کلام کو غیر معمولی نشریت عطا کرتی ہیں۔ بیسویں صدی میں اقبال نے زندگی و کائنات کے گوناگوں مسائل پر رائے زنی کا تیور غالب سے سیکھا۔ اس عہد میں بے چارگی وافسردگی کا جو ایک عام میلان تھا اس کو انسانی عظمت کے نغموں سے ختم کرنے کی کوشش کی۔ فارسی زبان کی خوش رنگ اور پر شکوہ تراکیب سے شاعری کے وقار میں اضافہ کی طرف غالب کے بعد اردو شعرا کی ایک پوری نسل متوجہ ہوئی۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی بیسویں صدی کی شاعری غالب کے طرز فکر اور آہنگ کے سہارے تخلیق کی گئی۔ الفاظ کو نئے ڈھنگ سے استعمال کرنے کا ڈھنگ ہمارے عہد نے غالب سے سیکھا۔ آخر اسی عہد میں انشاء مصحفی ناسخ اور دیگر شعرا تھے جنہوں نے شاعری کے دفتر کے دفتر تخلیق کیے لیکن غالب کی سطح تک نہ پہنچ سکے۔

غالب اپنے ابتدائی دور کے طرز سخن تک اگر خود کو محدود کر لیتے تو ناسخ کے ہمزاد بن کر رہ جاتے حالانکہ ابتدائی دور میں اپنی مشکل پسندی اور مشکل گوئی پر انہیں ناز تھا۔

اسدؔ ہر جا سخن میں طرز باغ تازہ ڈالی ہے　　مجھے رنگ بہار ایجادی بیدل پسند آیا

اس دور کی بے کیف مضمون آرائی کا مزاج اگرچہ بعد کے دور تک کہیں کہیں جھلکنے لگتا ہے لیکن بعد میں معنی آفرینی کا رحجان اور لفظ و معنی میں ہم آہنگ واتحاد نے ان کو مشکل گوئی کے دلدل سے باہر لا کھڑا کیا، اور وہ اپنے عہد کو احساس زیاں کی چنگاری برقرار رکھنے اور پر فریب رنگ طرب سے دھوکا نہ کھانے کا مشورہ واضح اور صاف الفاظ میں دینے لگے۔

گردش رنگ طرب سے ڈر ہے　　غم محرومی جاوید نہیں

غالب عیش ومستی کے ایک تباہ کن دور کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ خود ان کی جوانی اسی سرمستی کی نذر ہو چکی تھی اور اب اس کا خمیازہ بھگت رہے تھے جس میں مغلیہ تہذیب کے دور

زوال میں بیشتر امیر زادے مبتلا تھے اور اپنے بچے کھچے وسائل سے مسرتوں اور لذتوں کا آخری قطرہ نچوڑ لینا چاہتے تھے۔ غالب اس قوم کے مقدر کے بارے میں تشویش میں آخری دور میں مبتلا تھے جو اپنی منزل سے بے خبر ہے اور اپنے صحیح راہبر کو پہچاننے کی صلاحیت بھی کھو چکی تھی۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر ایک تیز رو کے ساتھ　　پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

آخری دور میں انہیں احساس تھا مضبوط اخلاقی بنیادوں کے بغیر حوادث کی تیز آندھی کے سامنے قدم جمانا ممکن نہیں۔ چنانچہ وہ بھی ناسخ لکھنوی کی طرح اخلاقی تعلیمات کے چراغ روشن کرتے ہیں۔

جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنئے　　جو نا سزا کہے اس کو نہ نا سزا کہئے

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے　　کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

غالب پر ساری عمر طرح طرح کے مصائب و مشکلات کے بادل چھائے رہے۔ ذاتی زندگی کی صعوبتوں کے سوا خود ان کی شاعری کا جو مذاق اڑایا گیا وہ کم الم ناک نہ تھا۔ اس کے ہم عصر ناسخ کو بھی ماحول کے ستم سہنے پڑے لیکن اس حد تک نہیں بیدل اور شاہ نصیر کے تتبع میں وہ جب تک شاعری کرتے رہے ان کے ہم عصر انہیں مہمل گو کہتے رہے۔ حکیم آغا جان عیش نے یہاں تک کہہ دیا۔

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے　　مزہ کہنے کا جب ہے ایک کہے اور دوسرا سمجھے

کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے　　مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

غالب جب دیوان مرتب کرنے چلے تو علامہ فضل حق خیر آبادی کے مشورے سے مشکل کلام کا بڑا حصہ نکال دیا جس کی وجہ سے موجودہ دیوان کی کشش میں بے حد اضافہ ہو گیا اور وہ آج تک بے بدل بنا ہوا ہے۔ اپنی ساری پریشانیوں کے باوجود جس کا بڑا درد ناک اظہار انہوں نے دو فارسی خطوں میں جو استاد ناسخ کے نام لکھے گئے ہیں کیا ہے۔ قمار بازی اور قرض خواہوں کے جور و ستم کی وجہ سے ان کو خانہ نشین ہونا پڑا۔ نواب شمس الدین کی ولیم فریزر کے قتل کے الزام میں گرفتار اور پھانسی نے غالب کو بے حد بدنام کر دیا پھر مرزا قتیل پر ان کے اعتراضات نے انہیں علمی حلقوں میں بے حد نامقبول بنا دیا بقول ابن فرید" زندگی کی جولا نگاہ میں جو شخص بیک وقت

اتنے رخوں سے نامساعدت کا سامنا کرے اور پھر بھی زندہ رہے اور زندگی کا ثبوت دے وہ معمولی اعصاب کا انسان نہیں ہوسکتا ورنہ اس کا حشر بھی وہی ہوتا جو مرزا یوسف کا ہوا۔ غالب کو اس لحاظ سے آہنی اعصاب کا حامل قرار دیا جاسکتا ہے۔'' (چہرہ پس چہرہ۔ابن فرید ص 54)

اسی آہنی اعصاب نے انہیں انانیت پرست بنادیا، وہ اپنے مقابلے میں دوسروں کو خاطر میں نہیں لاتے۔

پوچھا تھا گرچہ یار نے احوال دل مگر کس کو دماغ منت گفت وشنید تھا

لیکن اس آہنی اعصاب کا انسان بھی کبھی کبھی ہمت ہار جاتا ہے۔ بقول ابن فرید وہ کبھی مرنے کی آرزو کرنے لگتا ہے اور کبھی تہیہ طوفاں کر کے بیٹھ جاتا ہے۔

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

کس سے محرومی قسمت کی شکایت کیجئے ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سو وہ بھی نہ ہوا

غالب کے لکھنوی ہم عصروں بالخصوص ناسخ کے یہاں یہ کیفیت نظر نہیں آتی۔ وہ ایسی بلند آہنگی سے نغمہ سرا تھے جسے دیکھ کر ذوق اور غالب بھی رشک کرتے تھے۔ ناسخ کے ان اشعار نے مرزا غالب کے دل میں بھی گدگدی پیدا کردی۔

میرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا طلوع صبح محشر چاک ہے گریباں کا

وہ شوخ فتنہ انگیز اپنی خاطر میں سمایا ہے کہ اک گوشہ ہے صحرا قیامت جس کے داماں کا

تہہ شمشیر قاتل کس قدر بشاش تھا ناسخ کہ عالم ہر دہان زخم پر ہے روئے تاباں کا

تصورات کی دنیا آباد کرنے اور حسرتوں کا مزہ لے لے کر ذکر کرنے کے انداز بیان میں ناسخ کا کوئی جواب نہیں۔

اپنے ہونٹوں سے جو اک بار لگا لیتے وہ ہے یقیں ساغر مئے چشمہ حیواں ہوتا

ناسخ کے شاگرد خواجہ وزیر نے بھی ایسے اشعار کہے جو دہلوی اساتذہ کے لئے بھی باعث رشک ہوئے۔

چلا ہے او دل راحت طلب کیا شادماں ہوکر زمین کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہوکر

اسی خاطر تو قتل عاشقاں سے منع کرتے تھے اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہوکر

ہم اسیروں کو قفس میں بھی ذرا چین نہیں روز دھڑکا ہے اب کون رہا ہوتا ہے

مگر غالب کی جواد انہیں گذشتہ اور موجودہ صدی کا ایک مقبول پسند سخنور بناتی ہے وہ ایک دل فروز راجائیت ہے وہ اپنی ذاتی محرومیوں اور ماحول کی ناموزونیت کے باوجود زندگی وزندہ دلی کا پرچم بلندر کھتے ہیں۔ اس رجائیت کا سرچشمہ توحید یعنی خدا پر کامل بھروسہ ہے۔ غالب ایک راسخ العقیدہ موحد ہیں۔ اس کائنات کے عظیم خالق پر پختہ یقین کو وہ اپنے عہد کے سارے آشوب وابتلا کا مداوا تصور کرتے ہیں۔

ہے تجلی تری سامان وجود　　ذرہ بے پر تو خورشید نہیں

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے　　پر تو سے آفتاب کے ذرہ میں جان ہے

غالب کی اپنے مایوس کن اور حوصلہ شکن ماحول میں بے مثل رجائیت اور سر بلندی کی ادا ہمارا دل موہ لیتی ہے۔

ہر چند جانگدازی قہر و عتاب ہے　　ہر چند پشت گرمی تاب وتواں نہیں

جاں مطرب ترانہ ہل من مزید ہے　　لب پردہ سنج زمزمہ الاماں نہیں

کون ہوتا ہے حریف مئے مردافگن عشق　　ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

غالب کی اپنے عہد کے شعرا میں یہ انفرادیت ہے کہ وہ نئے عہد کے تقاضوں کا شعور رکھتے ہیں اور اندھی تقلید کے دلدل سے باہر نکلنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

وہ بادۂ شبانہ کی سر مستیاں کہاں　　اٹھیے بس کہ اب کہ لذت خواب سحر گئی

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں　　مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

غالب کے پاس اگر چہ اقبال کی طرح کوئی نظام فکر نہیں لیکن وہ انسانی زندگی کے مسائل کی گرہ کشائی میں ہر آن الجھے نظر آتے ہیں۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد　　عالم تمام حلقہ دام خیال ہے

غالب اپنے عہد کے صوفیانہ فلسفہ وحدت الوجود کے شیدائی ہیں اور بقول پروفیسر اسلوب احمد انصاری مادی زندگی کی دلفریبیوں کی تحسین کا جذبہ اسی وجہ سے موجود ہے۔

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے　　پردہ وہ چھوڑا ہے اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

OO

پروفیسر علی احمد فاطمی

غالب اور سیکولرزم

غالب اور سیکولرزم کے عنوان کے تحت یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ غالب جیسے شاعر کا سیکولرزم سے کیا لینا دینا تھا۔ سیکولرزم تو ایک جدید سماجی اور سیاسی اصطلاح ہے اور غالب اردو کے قدیم شاعر۔ ان دونوں کا کیا تال میل؟ یہ حیرانی ان صورتوں میں ضرور قابل قبول ہے جب سیکولرزم کو واقعی جدید اور محض ایک سماجی، سیاسی اصطلاح، نعرہ یا سلوگن سمجھ لیا جائے اور غالب کو شراب و شباب کا قدیم روایتی اور رومانی شاعر......لیکن سچ تو یہ ہے کہ صورت حال ان دونوں سے مختلف ہے۔ یہ درست ہے کہ سیکولرزم کی اصطلاح مغربی اصطلاح ہے اور یہ لفظ لاطینی زبان سیکولم سے بنا۔ جس کے معنی دنیا کے ہوتے ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا امریکانہ میں سیکولرزم کو ایک ایسے اخلاقی نظام سے تعبیر کیا گیا ہے جو قدرتی اخلاق کے اصول پر مبنی ہے۔ اس کی پہلی شرط فکر کی آزادی ہے۔ یعنی ہر شخص کو آزاد ڈھنگ سے سوچنے کا حق ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جذبہ نیا نہیں ہے اور کسی بھی طرح جدید یا مغرب سے جوڑ کر محدود یا مشروط نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تو زندگی کا ایک رویہ ہے۔ ایک طرز حیات، جو کائنات کے ہر اس خطہ میں اپنایا جاسکتا ہے جہاں کے انسان خردمند ہوں اور ہوش مند ہوں اور ان کو آزاد اور کھلی فضا میں جینے کا حوصلہ ہو۔ انسان کی فطری جبلت کے تحت بھی یہ تقاضا ہوا کرتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اصطلاحی معنوں میں اسے پہلی بار آزاد خیال انگریز جارج جیکب ہولی اوک نے 1840ء میں استعمال کیا۔ وہ ایک رسالہ ''ندائے عقل'' نکالتا تھا جس میں عقل پرستی اور آزاد خیالی کی تبلیغ کرتا تھا۔ 1851 میں اس نے سنٹرل سیکولر سوسائٹی کے نام سے ایک انجمن قائم کی۔ اس کا خیال تھا کہ انسان کی سچی رہنما سائنس ہے۔ اخلاق مذہب سے جدا اور ایک پرانی

حقیقت ہے۔علم وادراک کی واحد کسوٹی اور سند عقل ہے۔ ہر شخص کو فکر اور تقریر کی آزادی ملنی چا ہیے۔ہم کو اس دنیا کو بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ رسالہ، یہ سوسائٹی اور یہ اصطلاح ایک مخصوص ماحول اور معاشرہ کے خلاف وضع کیے گئے، ورنہ ایسا نہیں ہے کہ اس سے قبل انسانوں کے رویے سیکولر نہ تھے یا وہ ان خیالات سے واقف نہ تھے۔ممتاز دانشو سبط حسن نے اچھی بات لکھی ہے کہ انسانوں کا عمل تو سیکولر تھا، ان کی سوچ سیکولر نہ تھی۔ وہ اور آگے لکھتے ہیں:

''سیکولرزم ایک ایسا فلسفۂ حیات ہے جو خردمندی اور شخصی آزادی کی تعلیم دیتا ہے اور تقلید اور ہدایت پرستی کے بجائے عقل وعلم کی اجتہادی قوتوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔''

تصوف کا اگر باریکی سے جائزہ لیا جائے تو ہمارے صوفیائے کرام بھی زندگی کے ایسے ہی روشن رویوں کی تبلیغ کرتے آئے ہیں۔خودشناسی اور انسان دوستی کا پیغام دیتے آئے ہیں، اور بھی صورتیں ہیں جن کی روشنی میں یہ بات آسانی سے کہی جاسکتی ہے کہ سیکولرزم محض ایک نعرہ یا بندھی ٹکی اصطلاح نہیں ہے بلکہ ایک کھلاڈلا روشن اور وسیع رویہ ہے اور اس کی تاریخ بھی اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ تاریخ انسانی۔

سیکولرزم کا رویہ ہزار پرانا ہو لیکن اسے بھی نئی شکل اس وقت ملی جب قرون وسطیٰ میں رومن کیتھولک پادری دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک وہ جو شدت پسندی کی وجہ سے محض خانقاہوں میں بند رہتے تھے، باہر کی دنیا سے ان کا تعلق نہ ہونے کے برابر تھا۔دوسرے وہ جو عام شہریوں کی سی زندگی بسر کرنا پسند کرتے تھے۔ دوسرے قسم کے پادری سیکولر پادری کہلائے اس لئے کہ اہ اپنے ساتھ عوام اور معاشرے کو لے کر چلتے تھے۔ پھر جب جارج اوک نے اسے باقاعدہ علمی وفکری شکل دیتے ہوئے اپنے قلم اور قدم کے ذریعے اسے ایک مشن کی شکل دی تو اسے اس کی سزائیں بھگتنی پڑیں۔اس نے سزائیں ضرور برداشت کیں لیکن سیکولرزم کو عام کرنے میں وہ خاصا کامیاب ہوا۔

یہ بات محض اتفاق نہیں ہے کہ مغرب کا یہ زمانہ ٹھیک وہی زمانہ ہے جو مشرق میں یعنی ہندوستان میں راجارام موہن رائے کا زمانہ غالب اور سرسید کا زمانہ ہے۔ یہ کہنا اگرچہ مناسب نہ ہوگا کہ برصغیر میں سیکولر خیالات محض مغربی افکار و خیالات کے تحت داخل ہوئے اس لیے کہ مبہم اور غیر واضح

صورتوں میں سیکولر خیالات مختلف شکلوں میں یہاں پہلے سے موجود تھے۔ دانشور سبط حسن لکھتے ہیں:

"اردو فارسی کے کلاسیکی ادب میں بالخصوص شاعری میں جو ہمارے جذبات واحساسات کا آئینہ ہے، سیکولر فکر کی روایت بہت پرانی ہے۔ اس طرز فکر کے ہدف معاشرے کے وہ عناصر تھے جو جبر واستبداد کی علامت بن گئے تھے اور انسان دشمنی، تعصب اور تنگ نظری کے اظہار میں وہ یہ کردار ادا کرتے تھے جو قرونِ وسطیٰ میں مغربی کلیسا کا تھا۔ ہمارا شاید ہی کوئی شاعر ہو جس نے اسلامی تعلیمات کی پیروی کرنے کے باوصف کوتہ آستین ملاؤں کی دراز دستیوں پر، زہاد زشت خو کی ہوسنا کیوں پر، پیران سالوس کی شعبد بازیوں پر، مفتیانِ شرع کی اقتدار پرستیوں پر، محتسبوں کی تردامنیوں پر، واعظوں کی لن ترانیوں پر اور فقیہانِ شہر کی ریاکاریوں پر لعن طعن نہ کی ہو۔ کیونکہ اس دور میں سیکولر خیالات و جذبات کے ابلاغ کی یہی صورت ممکن تھی۔"

جہاں ایک طرف یہ سچ تھا تو دوسرا یہ بھی ہے کہ سیکولر خیالات کی نئی شکل، مغربی علوم اوران کے نت نئے نظم ونسق اور جدید صنعت وحرفت کے حوالے سے آئی اور جس کا براہ راست اثر ہندوستانی صالح دانشوروں اور شاعروں نے قبول کیا جس میں راجہ رام موہن رائے اور سر سید خاص تھے۔

ترقی یافتہ اور روشن خیال صوبۂ بنگال میں جنمے موہن رائے علم وفکر سے لبریز متعدد زبانوں کے ماہر اور فارسی اخبار "مراۃ الاخبار" کے مدیر اسلامیات سے گہرا شغف رکھتے تھے اور فلسفہ وحدت الوجود پر گہری نظر رکھتے تھے، پادریوں اور پنڈتوں سے براہ راست مناظرہ کرتے۔ یہ سب ایک طرف، دوسری طرف انگریزی تعلیم اور مغربی علوم کی زبردست حمایت بھی کرتے۔ ہر علم وفکر کو علم و دانش کے حوالے سے دیکھنا، انسان دوستی کی تبلیغ کرنا ان کے محبوب مشغلے تھے۔ برہمو سماج کی تشکیل کرکے انھوں نے مذہبیات کو جو ایک روشنی، نیا راستہ دیا وہ ان کا غیر معمولی کارنامہ ہے۔ ذات پات کی تفریق، بت پرستی اور ستی پرتھا کے وہ سخت خلاف تھے۔ وہ سنسکرت کی تعلیم کے بجائے ریاضی، نیچرل فلسفہ اور دوسرے مفید مضامین کے حمایتی تھے۔ بنگال جو علمی اور ثقافتی معاملات میں دوسرے

صوبوں کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے آگے بڑھا، اس میں راجا رام موہن رائے کا اہم ہاتھ ہے۔

جو کام موہن رائے نے ہندوؤں میں کیا، کم وبیش وہی کام مسلمانوں میں سید احمد خاں نے کیا۔ سرسید کا پورا کارنامہ محض علمی وادبی نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے عملی تجربات اور ہندوستان کے معروضی حالات تھے۔ انھوں نے صاف محسوس کرلیا تھا کہ مسلمانوں کے حالات مغربی علوم کو حاصل کیے بغیر سدھرنے والے نہیں ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمان محض دینی رسومات اور مولویوں کے ذریعے بخشے گئے توہمات کے پیچھے بھاگتا رہے گا تو اس کا بھلا کبھی نہیں ہوگا۔ انھوں نے اپنے اخبار اور اپنے بعض غیر معمولی اعمال واقدام کے ذریعے جس طرح انگریزی تعلیم اور مغربی علوم کی حمایت کی اور جس طرح قدیم طرز تعلیم اور علوم کی مخالفت کی اس سے ان کے واضح روشن اور سیکولر خیالات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ ہر چند کہ اس کی انھیں قدم قدم پر قیمت ادا کرنی پڑی لیکن وہ یہ کہنے میں ذرا بھی نہیں جھجکے کہ مسلمانوں کے دنیاوی مسائل دعا، تعویذ، نذرو نیاز، منتوں، چڑھاوؤں سے یادگاہوں کی چوکھٹ چومنے، چلّے کاٹنے اور زر پرست پیروں کی جھولیاں بھرنے سے حل نہیں ہوں گے بلکہ ان کی نجات توہمات کے اس طلسم کو توڑنے ہی میں ہے۔ ہم مغربی علوم وافکار اور مغربی تہذیب وتمدن کو اپنا کر ہی دوسری قوموں کی طرح دنیا میں سرفراز ہو سکتے ہیں۔ (مقالات سرسید جلد 16۔ص 66)

مولانا حالی نے ''حیات جاوید'' میں متعدد جگہ اس بات کے اشارے کیے ہیں جہاں سرسید نے مروجہ عقائد سے اختلاف کیا ہے اور اس کی سائنسی اور عقلی تشریحیں کی ہیں۔ لیکن ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا سرسید کے سیکولر اور روشن نظریات وخیالات فی زمانہ اس طرح قبول کیے گیے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر سنجیدگی سے سوچنے کی ضرورت ہے، کیوں کہ سیکولرزم ہو یا کوئی بھی'' ازم'' ایسے خیالات ونظریات کو رائج اور مقبول ہونے کے لیے جس مخصوص سوسائٹی (کلکتہ کی طرح) کی ضرورت ہوا کرتی ہے وہ یو۔ پی اور شمالی ہند میں نہ تھی اور سرسید کے خیالات اکثر فیوڈل نظام کا شکار ہو گیے۔ حالانکہ اس کے باوجود تھوڑا آگے پیچھے مسلمانوں کے پڑھے لکھے طبقہ میں سرسید کی فکر سمجھی گئی اور قبول بھی کی گئی، جس کے اثرات بعد میں واضح ہوئے اور پہلی بار مسلم طبقہ سیاسی

افکار، جمہوری قدار اور ایک خاص معنوں میں روشن خیالی سے آگاہ ہوا اور سماج و معاشرہ، وجود و عدم وجود، علم و دانش کے حوالے سے بہت سارے سوالات ذہنوں میں پرورش پانے لگے۔

غالب کا زمانہ راجا رام موہن رائے اور سرسید کے درمیان کا زمانہ ہے اور بھرپور نشاۃ الثانیہ کا زمانہ، لیکن اس سے قبل غالب کے کچھ ذاتی حالات اور اس عہد کی مزید کچھ نزاکتوں پر غور لازمی ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ غالب کو عقل و علم پسند، انسان پرست، روشن خیال اور سیکولر بنانے میں اس دور کا بڑا ہاتھ ہے اور کچھ اس حد تک کہ وہ اپنے شعبہ میں اپنے بعض ہم عصروں سے نہ صرف منفرد و ممتاز ہوئے بلکہ اپنے ڈھنگ سے زندگی کو شاعرانہ و فنکارانہ طور پر تو پیش کیا ہی ایک نئی زندہ تابندہ امیج بھی پیش کی۔ زندگی اور زندہ دلی کی نئی مثالیں قائم کیں اور بقول سبط حسن جن کی نگاہیں موت کے ملبے میں زندگی کے ابھرتے ہوئے آثار دیکھ لیتی تھیں۔ وہ بقول خود ان آزادوں میں تھے جن کو ماضی کے مٹنے کا غم بیش از یک نفس نہیں ہوتا کیوں کہ ؎

برق سے کرتے ہیں روشن، شمع ماتم خانہ ہم

بعض ماہرین غالب نے ان کی اس روشن خیالی کی اصل وجہ ان کا کلکتہ کا سفر بتایا ہے جہاں وہ اپنے مقدمہ کے سلسلے مین گئے اور دو سال قیام کیا اور وہاں کی ترقی و تبدیلی سے متاثر ہوئے۔ یہ بڑی حد تک سچ تو ہے لیکن کچھ سچائیاں اور بھی ہیں۔ غالب جس خاندانی پس منظر سے تعلق رکھتے تھے وہ ابتدا سے ہی انگریز اور انگریزی تعلیم کا حمایتی تھا۔ ان کا پورا گھرانا انگریز حکام سے ربط و ضبط رکھتا تھا۔ لارڈ لیک نے آگرہ فتح کرنے کے بعد غالب کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ کو چار سو سواروں کا برگیڈیر مقرر کر دیا تھا۔ لوہارو خاندان جہاں مرزا کی شادی ہوئی تھی وہ بھی انگریزوں کا خیر خواہ تھا۔ اس کے علاوہ جب غالب دہلی پہنچے تو کچھ برسوں کے بعد دہلی کالج کی نئی تعلیمی صورتیں سامنے آئیں۔ وہ دہلی کالج جو بقول بابائے اردو عبدالحق:

''یہی وہ پہلی درسگاہ تھی جہاں مشرق و مغرب کا سنگم قائم ہوا۔ اس ملاپ نے خیالات کے بدلنے، معلومات میں اضافہ کرنے اور ذوق کی اصطلاح میں جادو کا کام کیا اور ایک نئی تہذیب

اور نئے دور کی بنیاد رکھی اور ایک نئی جماعت ایسی پیدا کی جس سے ایسے پختہ، روشن خیال اور بالغ نظر انسان اور مصنف نکلے جن کا احسان ہماری زبان اور ہماری سوسائٹی پر ہمیشہ رہے گا۔''

ایسے ہی دور میں جب کلکتہ پہنچتے ہیں تو وہاں راجا رام موہن رائے کی تحریک اور اس کے خوشگوار اثرات دیکھ کر متاثر ہوتے ہیں، مغربی علوم کا دور دورہ، جدید صنعت و حرفت کی تجلّیات، ایک بدلہ ہوا ترقی یافتہ ماحول، نئے نئے قوانین کی آمد آمد جس مین شخصی آزادی، فکری آزادی، عدلیہ کا مساوی رویہ، تبدیلیٔ مذہب کا ہر بشر کو حق، خون بہا کا خاتمہ اور قتل کو پبلک جرم قرار دیا جانا، ستی پرتھا کا خاتمہ اور عقد بیوگان کی تحریک.....ظاہر ہے کہ غالب جیسے آزاد خیال اور انسان دوست کے ذہن میں یہ نئے نئے قاعدے قانون اپنی جگہ بنا گئے اور وہ غالب جو پہلے سر سید کی کتاب ''آثار الصنادید'' کی تعریف کرتے تھے انھیں کی دوسری کتاب ''آئین اکبری'' کو یہ کہہ کر ناپسند کرتے ہیں کہ ''مردہ پروردن مبارک کارِ نیست'' اہل علم واقف ہیں کہ غالب نے اپنی اس منظوم تقریظ میں کس طرح مغربی علوم کی تعریف کی ہے۔

ہندوستانی نشاۃ الثانیہ کا یہ دور تعمیر و تخریب کے حوالے سے ایک تاریخی دور تھا۔ ہندوستان کی سیاسی اتھل پتھل اور انگریزوں کا غلبہ اور ان کی حکومت محض ایک سیاسی عمل نہ تھا بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو انگریزوں کی آمد، مداخلت اور حکومت کے جملہ سلسلۂ عمل میں خود ہندوستان کی سماجی اور داخلی تفریق کو جس قدر دخل ہے شاید اتنا حکومت وقت کی کمزوری کا نہیں۔ یہ تفریق بادشاہ سے تا وزیر اور وزیر سے تا عوام پھیلی ہوئی تھی۔ قوموں، طبقوں، قبیلوں کے درمیان جذب و پیوست تھی۔ پروفیسر ممتاز حسین نے اس تاریخی حقیقت کو اس طرح پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''بالعموم یہ تصور کیا جاتا ہے کہ انگریزوں کا تسلط صرف سیاسی اسباب کی بنا پر وقوع پذیر ہوا.....یہ صورت صرف اس وجہ سے پیدا نہ ہوئی کہ برصغیر سیاسی انتشار اور طوائف الملوکی کا شکار تھا بلکہ اس وجہ سے بھی کہ اس کی سوسائٹی مختلف اقوام کے فرق، ذات پات کے فرق، قوم قبیلے کے فرق کے ایک ایسے توازن پر قائم تھی جس میں اتحاد اور یگانگی کم اور نفاق اور علیحدگی زیادہ

تھی۔"(غالب ایک مطالعہ)

غالب کا دور ایک عبوری دور تھا۔ ایک ایسا دور جہاں کئی طرح کے نئے پرانے خیالات، روایات باہم تضاد وتصادم میں مبتلا تھے۔ صدیوں کی روایت سے الگ ہونا اور ایک نئی راہ نکالنا، اس کا استقبال کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا لیکن غالب نے ایسا کر دکھایا اس لئے کہ ان کے نزدیک زندگی کوئی ساکت وجامد شئے نہیں تھی۔ ہر دور میں زندگی اپنا راستہ تلاش کرتی ہے اور بہتر سے بہترین شکل اختیار کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ایسا غالب کو یقین تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غدر کو محض ایک سیاسی واقعہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس سیاسی تبدیلی کو زندگی کی ایک بڑی حقیقت سمجھ کر قبول کر رہے تھے۔ انھیں قتل وغارت گری کا دکھ ضرور ہے لیکن مغلیہ حکومت کے جانے کا رنج نہیں اور نہ ہی انگریزوں کی آمد کا دکھ۔ صاف اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے پیچھے غالب کا تاریخی شعور اور صوفی مزاج کام کر رہا ہے جو دنیا کو متحرک سمجھ کر نہ صرف قبول کرتا ہے بلکہ تبدیلیوں کا استقبال بھی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے "کہ مہر نیم روز" میں وہ صاف طور پر لکھتے ہیں۔" دنیا یوں ہی چلتی رہے گی، آدم کے بعد آدم آتے رہیں گے۔" آدم کے تئیں یہ خوش فہمی، خوش عقیدگی دنیاوی اعتبار سے ان کی ترقی پسند خیال کو ظاہر کرتی ہے۔ چونکہ غالب نے زندگی کا ایک بڑا حصہ پنشن اور روزی کے لیے جدوجہد کرتے گزارا۔ اس لئے ان کے پاس عملی زندگی کا باقاعدہ تصور تھا۔ سماجی، معاشرتی اور طبقاتی زندگی کا عملی تصور جو ان کے خطوط میں بطور خاص جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کا اجتماعی تصور ان کے پاس کم تھا۔ انفرادی طور پر سہی انھوں نے اپنے عمل اور علم کے ذریعہ اپنی فکر اور ادب کو دنیا رنگ دینے کی کوشش کی۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ وہ دور ہے جب مغرب میں اشتراکیت، جمہوریت اور سیکولرزم کی آوازیں اٹھ چکی تھی۔ مختلف فلسفے مارکس کے فلسفہ میں ضم ہو کر نئی انسانی دنیا کا تصور پیش کر چکے تھے۔ لیکن ان سب کی گونج پورے طور پر ہندوستان میں اس وقت تک پہنچی ہوگی کہا نہیں جا سکتا۔ لیکن خود ایرانی تصوف کی سخت گیری کے خلاف جو ماحول بن رہا تھا وہ تازہ ترین افکار کی ضرب سے محفوظ رہا ہوگا، یہ سوچ پانا بھی مشکل ہے۔ بہر حال غالب

نے ایسی تمام سخت گیریوں کی سخت مخالفت کی۔ حالانکہ ایک جگہ ممتاز ناقد ممتاز حسین نے اپنے ایک انتخاب میں غالب کی زبانی یہ بات بھی لکھی ہے:

''چونکہ میری عجمی فطرت ماوراءالنہری علماء کی خشک مغزی سے میل نہ کھاتی تھی میں نے سمر قندی حنفی سنی مذہب کو ترک کردیا اور عجم کی شیعت کی طرف مائل ہوگیا لیکن اپنی ذات کو جیسا کہ اہل تصوف کا پیشہ ہے ہر قسم کے دینی اور ملی تعصب سے پاک رکھا۔ میری نظر میں ہندو، مسلم، عیسائی، زرتشتی، سنی شیعہ سب برابر تھے۔''

احتشام حسین نے بھی اپنے مضمون ''غالب کا تفکر'' میں پتے کی بات لکھی ہے:

''اسلام اور دوسرے مذاہب کا مطالعہ، تاریخ، اخلاقیات، ہیئت، طب، منطق، تصوف یہی وہ علوم ہیں جو رائج تھے اور انھیں سے غالب نے زندگی کو سمجھنے میں مدد لی تھی۔ غالب صوفی مشرب ہونے اور وحدالوجود مین عقیدہ رکھنے کے باوجود تصوف کے سارے اصولوں کو علمی صوفیوں کی طرح نہیں مانتے تھے۔ وحدت الوجود کی طرف ان کا میلان کچھ تو مسائل کائنات کے سلسلے میں پیدا ہوا تھا اور کچھ مذہب کی ان ظاہر داریوں سے بچ نکلنے کا ایک بہانہ تھا جو ان کی آزاد پسند طبیعت پر بار تھیں۔ غالب جس سماج کے فرد تھے اس سماج میں باغیانہ میلان اور آزادی کا جذبہ داخلی طور پر تصوف میں ہی نمایاں ہوسکتا تھا کیونکہ غالب کو کوئی واضح خارجی سہارا آزادی کے لئے حاصل نہ تھا۔ کوئی علمی یا ادبی تحریک جس سے وابستہ ہوکر وہ اپنے طبقہ کے ماحول میں گھرے ہوئے ہونے کے باوجود آگے بڑھ جاتے، موجود نہیں تھیں.....وہ زمانہ کچھ دن بعد آیا۔''

تصوف کے حوالے سے دنیا کو سمجھنے اور اسے بدلنے کا تصور ہی فی زمانہ ایک سیکولر تصور تھا جس نے بعد میں ایک اصطلاح کی شکل اختیار کرلی۔ سیکولرزم کا ابتدائی تصور بھی کچھ ایسے ہی مذہبی افراد سے وابستہ تھا جو دنیا سے کٹ کر نہیں دنیا کو لے کر چلنا چاہتے تھے۔ دوسری مشکل احتشام حسین نے یہ بتائی کہ ان سب باغیانہ اظہار کے لئے ان کے پاس کوئی خارجی سہارا نہ تھا لیکن ایک مشکل اور بھی تھی کہ غالب کوئی مصلح یا رفارمر نہ تھے بلکہ وہ ایک فنکار تھے، شاعر تھے اور وہ بھی غزل کے

شاعر اور ہم سب جانتے ہیں کہ غزل داخلی صنف سخن ہے۔ خارجی سہارے کی کمی نے ان کی داخلی کیفیت کو اور پروان چڑھایا۔ وہ سب کے سب بڑے سلیقے سے اپنے باطن میں جذب کرتے رہے اور باطنی انجذاب و امتزاج کی صورتیں بے حد عجیب و غریب ہوا کرتی ہیں۔ خارجی دباؤ باطن میں گھل مل کر ایک عجیب نازک نفسیات کی شکل اختیار کرتے ہیں جسے غالب جیسے شاعر کے یہاں تلاش کرنا بہت مشکل ہے اور اس رنگا رنگی کو کوئی وحدت قرار دینا اس سے بھی زیادہ مشکل، تاہم کچھ اشارے ہی کیے جاسکتے ہیں۔

غالب ایک آزاد فطرت کے انسان تھے۔ مذہب، سماج، رسم و رواج وغیرہ کی پابندی انھیں کسی طرح منظور نہ تھی۔ ہر چند کہ وہ وحدانیت، رسالت وغیرہ کے قائل تھے لیکن یہ سب باتیں ایک حد تک فکر و نظر کا حوالہ بنتی ہیں۔ اس سے زیادہ نہیں ورنہ وہ بار بار کیوں کہتے ۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن	دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے
جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد	پر طبیعت ادھر نہیں آتی
کیا زہد کو مانوں نہ ہو گرچہ ریائی	پاداش عمل کی طمع خام بہت ہے
طاعت میں تار ہے نہ مے و انگبیں کی لاگ	دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو
واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو	کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

اس کے علاوہ اور نہ جانے کتنے اشعار ہیں جن میں اظہار نمائش پر طنز، ریاکاری پر حملے، تصور و تخیل پر ضربیں ہیں جو ان کی عقل پرستی اور روشن خیالی کے ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غالب معقولات سے دلچسپی رکھتے تھے۔ فقہ، حدیث، مسائل دین وغیرہ سے ان کی دلچسپی ہرگز نہ تھی اسی لئے ان کی شاعری میں زہد و اتقا، خوف عقبیٰ اور حور و قصور کا ذکر نہیں کے برابر ہے۔

ان سب باتوں کا ایک قابل غور پہلو یہ بھی ہے کہ ان سب امور کو غالب نے کسی مفکر یا فلسفی کی طرح نہیں لیا بلکہ ایک عام سے انسان کی طرح فطری رد اور قبول کی منزلوں سے گزرے۔ اگر ایک طرف غالب نے انگریزوں کے ذریعہ لائے مغربی اور صنعتی انقلاب کا استقبال کیا تو دوسری

طرف 1857 کی جنگ میں ان کی حریت بھی جاگ اٹھتی ہے۔ بہادر شاہ ظفر کا سکہ لکھتے ہیں تو دوسرے طرف قلعہ معلیٰ کو نامبارک بھی قرار دیتے ہیں۔ ایک طرف اچھا کھانا، اچھا رہنا، شراب نوشی اس پر خودداری اور دوسری طرف پنشن کی بازیابی، مقدمہ بازی اور دیگر صعوبتیں اور حد یہ کہ صعوبت زندانی غالب کو زندگی اور زندگی کے مسائل کے بہت قریب لے آئی۔ جو آدمی ساری زندگی حصول رزق میں جان کھپاتا رہا ہو اس کے دل ودماغ میں انسانی ہمدردی، دردمندی کا پیدا ہونا عین فطری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب زندگی بھر قلب وجگر میں نقب لگاتے رہے اور ریاکاری کو بے نقاب کرتے رہے اور ایک نئے انسان، نئے سماج کی تعمیر کی خواہش دل میں پالتے رہے۔ وہ خود ہی لکھتے ہیں:

> ''بس یوں سمجھو کہ میرا مسلک انسان دوستی کا تھا۔ میں اس مستقبل کو دیکھ پایا تھا کہ انسان اپنے تمام تعصبات ذہنی اور قلبی کو مٹا کر ایک انجمن میں ہو جائے گا۔''

بروزے کہ مردم شوند انجمن شود تازہ پیوند جانہا بہ تن (انتخاب غالب)

ممتاز حسین نے بھی لکھا ہے۔ ''وہ ہر قسم کے مذہبی اور قومی تعصب سے بلند ہو چکے تھے۔'' بندہ پرور میں تو بنی آدم کو مسلمان یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں۔ ان سے اس کی توقع کرنا کہ وہ فرنگیوں کے خلاف مشروط جہاد کو درست سمجھتے ہوں گے سچ نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اپنے عزیز دوست مولوی فضل حق کے بارے میں یہ کیوں لکھتے کہ ''انھیں اسلام میں بہت تعصب تھا اور ایسا کہ اسی فرط تعصب میں انھوں نے جان دی۔''........وہ شعور کی اس منزل میں تھے جہاں وہ پوری انسانیت کو ایک خاندان کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے تھے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان کی نظر اس سے بھی آگے کسی ایسے منظر کی تلاش میں تھی جہاں سے وہ پوری کائنات پر معروضی نگاہ ڈال سکتے تھے۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے عرش سے ادھر ہوتا کاش کے مکاں اپنا

یہ سچ ہے کہ سیکولرزم کی جدید اصطلاح سے غالب واقف نہ تھے لیکن وہ مغربی علوم کے اثرات اور اس میں زندگی وروشنی کے اثرات دیکھ کر قدامت، روایت، کہنگی اور فرسودگی کے شدید مخالف ہوئے اور نئے نظام کا استقبال کرنے لگے۔ اس نئے نظام سے مراد محض بھاپ اور بجلی کی ترقی نہیں بلکہ عقل

پرستی، دانشوری اور عدل وانصاف ہے جس میں انسان کو سراسر دخل ہے۔ اسی لیے وہ انسان، انسانیت وحریت کے بے حد قائل ہیں۔ تبھی تو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ ''میں انسان نہیں ہوں، انسان شناس ہوں۔'' اسی لیے وہ ایسے تمام اعمال وافراد کی مخالفت کرتے ہیں جو پرانے عقائد فرسودہ روایات کو لے کر چلنا چاہتے ہیں۔ سرسید کی کتاب بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ غالب اپنی ذات سے بھی اس قدر درد مند، انسان دوست تھے کہ بادشاہ سے لے کر امیروں اور میوہ فروشوں تک غالب کے دوستوں میں سے تھے اور یہ دوستیاں بلا تفریق مذہب وملت تھیں۔ بقول سردار جعفری:

> ''غالب کا مزاج ایرانی تھا۔ مذہبی عقائد، عربی تہذیب وتربیت ہندوستانی اور زبان اردو جس کو غالب نے بار بار ہندی اور ریختے کے نام سے یاد کیا ہے۔ ذہانت، طباعی اور سخن وری کا ملکہ پیدائشی تھا اور زندہ دلی، آزادہ روی اور خوش اخلاقی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ جب بیس پچیس برس کی عمر میں رنگ رلیوں سے دل ہٹ گیا تو صوفیانہ آزادہ روی اختیار کی اور ہندو، مسلم، عیسائی، ہندوستانی اور انگریز سب سے یکساں سلوک کیا۔ نماز پڑھی نہیں، روزہ رکھا نہیں، شراب کبھی ترک نہیں کی ہمیشہ اپنے آپ کو گنہگار کہا لیکن خدا اور رسول اور اسلام پر پورا ایمان رکھا۔'' (پیغمبران سخن)

ٹھیک ہے کہ اگر غالب سے متعلق یہ سوال آج بھی اپنی اہمیت رکھتا ہے کہ ان کے سامنے کوئی نظریہ کائنات یا باضابطہ فلسفۂ حیات تھا یا نہیں.....؟ لیکن جہاں تک سیکولرزم کا تعلق ہے..... سیکولرزم کوئی آسمانی یا کتابی فلسفہ نہیں، بلکہ انسان کے ایسے ہی مشترک، متوازن رویوں، فطری آزادی اور تعقل پسندی کا نام سیکولرزم ہے جو غالب کی شخصیت میں بدرجہ اتم موجود تھا اور انھیں حوالوں سے وہ فلسفہ ہمہ اوست اور وحدت الوجود کے قریب بھی آئے پھر بھی کوئی نظریہ صرف کتب بینی سے جنم نہیں لیتا۔ اس کے لیے زندگی پر مضبوط گرفت اور انسانوں کے دلوں پر دسترس ہونا ضروری ہے۔ زندگی کو سمجھنے میں غالب کے مطالعہ نے ضرور ساتھ دیا لیکن ساتھ ساتھ ہی بچپن کی یتیمی، دہلی کا قیام، کلکتہ کے سفر نے بھی اپنا اپنا رول تو ادا کیا ہی لیکن سب سے اہم رول تھا

زندگی بھر کا افلاس، جس نے غالب کی روح کو ہمشہ بے چین رکھا اور زندگی کو سمجھنے میں معاونت کی۔ زیادہ اہم یہ نہیں ہے کہ زندگی نے غالب کے ساتھ کیا سلوک کیے بلکہ اہم یہ بات ہے کہ غالب نے زندگی کے ساتھ کیا سلوک لیا۔ حیات وکائنات کے تئیں کون سے تصورات لیکر چلے۔ انسان دوستی اور انسان پرستی کے کیسے کیسے دیے روشن کیے......اور انسانی فکر کی نیرنگی اور بوقلمونی کس طرح ان کی شاعری میں منعکس ہوئی۔ آخر کوئی بات ہے کہ تمام تر جدید ہوتے ہوئے بھی وہ تصوف کے بعض خیالات سے مدد لیتے ہیں۔ اپنی مثنوی ''ابر گہر بار'' میں کائنات کو آئینۂ آگہی کہنے پر مجبور ہوتے ہیں اور اپنی غزلیہ شاعری میں زندگی کے بعض اہم فلسفے موت وزیست، فنا وبقاء، بہار وخزاں، رنگ ونور وغیرہ کو بڑے ڈھنگ سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ بار بار کہتے ہیں۔

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا　　نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

موج خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے　　آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا

ہے رنگ لالہ و گل ونسریں جدا جدا　　ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

قد وگیسو میں قیس وکوہکن کی آزمائش ہے　　جہاں ہم ہیں وہاں دار ورسن کی آزمائش ہے

غالب نے زندگی کو جس طرح سمجھا اور جس انداز سے اپنی شاعری میں پیش کیا اس کے بے شمار پہلو ہیں۔ متعدد پرتیں ہیں، نازک وپیچیدہ صورتیں ہیں جس کی مکمل تفہیم کسی ایک مضمون میں ممکن نہیں۔ عنوان کے حوالے سے تو ان کے تقریباً تمام پہلوؤں میں سے کوئی نہ کوئی ایسا نکتہ ضرور آتا ہے جس پر غور کیا جاسکتا ہے لیکن ان کے بڑے انسان ہونے کا سب سے مضبوط دعویٰ ان کے وہ اشعار ہیں جن میں وہ حضرت انسان کی مدح سرائی کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ انسان ہندو ہے نہ مسلمان وہ تو بس اس کائنات کے پردہ پر، اس کرۂ ارض پر، انسانی وجد سے سرشار ہیں۔ اس کی عقل ودانش، اس کے علمی وعملی کارناموں، اس کی امنگوں اور آرزوؤں، اس کی حسرت تعمیر پر کہیں حیران ہیں، کہیں نازاں وفرحاں۔ ان کی اس سوچ میں ذرا بھی تکلف وتصنع نہیں کہ دنیا کی ساری

روق انسان کے ہی دم سے ہے۔

زما گرم است ایں ہنگامہ بنگر شور ہستی را　　　قیامت مید مد از پردۂ خاکی کہ انساں شد

شوق تمنا، حسرت تعمیر، امکانات کا تصور یہ سب غالب کی ایسی دلکش اور معنی خیز اصطلاحیں ہیں جن میں معنی کی ایک نئی دنیا بسی ہوئی ہے۔ مثلاً ان اشعار کو دیکھئے۔

گھر میں کیا تھا کہ ترا غم اسے غارت کرتا　　　وہ جو ہم رکھتے تھے اک حسرتِ تعمیر سو ہے

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب　　　ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا، پایا

آتش افروزئی یک شعلۂ ایماں تجھ سے　　　چشمک آرائی صد شہر چراغاں مجھ سے

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے　　　ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

ان اشعار کو پڑھئے تو پہلی ساعت میں لگتا ہے کہ واحد متکلم کی خود کلامی ہے یا ایک مجذوب کی بڑ۔ جس پر اعتراض بھی کئے گئے اور شاید اسی لیے انھوں نے اپنے آپ کو نا آفریدہ گلشن کا عندلیب بھی کہا۔ لیکن وہ دنیا ہی کو لے کر دنیا کی پرواہ کیے بغیر نشاط تصور کی نغمی سنجی میں تا حیات مصروف رہے۔ ان کے یہاں میں سے مراد صرف غالب نہیں ہے بلکہ انسان ہے۔ ایک ایسا انسان جس کے پاس زندگی کا ایک بھر پور تصور ہے، ایک معقول ترقی یافتہ مستقبل کی خواہش کیوں کہ اسے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ پرانا سماج، پرانا نظام رخصت ہو رہا ہے اور ایک نئی دنیا تعمیر ہو رہی ہے۔ اس لئے کہ حضرت انسان کے ذریعہ خوب سے خوب تر کی تلاش جاری رہتی ہے اور اسے جاری رہنا بھی چاہیئے۔ غزل میں ایسی خارجی اور باہری دنیا کا اظہار مشکل سے ہوتا ہے لیکن غالب نثر میں ڈوبے ان اشعار کو کہنے میں بھی تکلف نہیں کرتے۔

نہ سنو گر برا کہے کوئی　　　نہ کہو گر برا کرے کوئی

روک دو گر غلط چلے کوئی　　　بخش دو گر خطا کرے کوئی

لیکن غزل کا داخلی انداز بڑے ہی خلاقانہ انداز میں کچھ عجب تیور و آہنگ سے ظاہر ہوا ہے کہ اس

اظہار میں اکثر سوالات ہیں کبھی طنز و تمسخر، کبھی تشکیک اور شکوہ و شکایت لیکن ان سب کو ملا کر غالب کے تفکر کا جو آہنگ بنتا ہے وہ گرمیٔ حیات اور گرمیٔ فکر کی ایسی قابل غور اور دل آویز تصویر پیش کرتا ہے جو قدماء و نیز ہم عصروں سے نہ صرف ممتاز و ممیز کرتا ہے بلکہ قدم قدم پر فکر کے نئے نئے در وا کرتا چلتا ہے جس نے نئے عہد میں بھی غالب کو سنگ میل قرار دیا۔ سردار جعفری لکھتے ہیں:

''انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتدا میں غالب کی مقبولیت میں جو اضافہ ہوا ہے اس میں اور باتوں کے علاوہ اس نئے مزاج کا بھی دخل ہے۔ یہ احساس آزادی سے پیدا ہونے والے نئے ہندوستان کے مزاج سے ہم آہنگ ہے جسے عظمتِ رفتہ پر ناز ہے اور دکھ بھی ہے اور نئی عظمت کی تلاش بھی ہے۔ غالب نے سیاسی شاعری نہیں کی لیکن نئے عہد کے مزاج کو سمولیا۔ اور نئے طوفان سے کھیلنے والے آئے تو انھوں نے بلا خیز موجوں سے لڑنے کے لیے غالب کی شاعری سے تقویت حاصل کی۔''

غالب کی شاعری کے متعدد پہلو ہیں لیکن ان کی فکر کا ایک بہت بڑا پہلو یہ تھا کہ انھوں نے بزم دنیا کو آراستہ کرنے اور اسے خوبصورت بنانے کا مسلسل خواب دیکھا۔ انسان کو انسانی فطرت کے حوالے سے بہتر بنانے میں ایک غیر معمولی شاعرانہ و فنکارانہ رول ادا کیا۔

آج اپنی ہی بنائی دنیا اپنی ہی ترقیوں میں ڈھلا انسان اپنی ہی بنائی ہوئی مشین کا کچھ اس طرح پرزہ ہو کر رہ گیا ہے کہ خود اس کے پرزے پرزے اڑے جا رہے ہیں۔ ایک طرف انسان سے انسانیت رخصت ہو رہی ہے تو دوسری طرف آزادی۔ جمہوریت، سیکولرزم وغیرہ کے تصورات درہم برہم ہو رہے ہیں۔ کلام و سخن اور دار و رسن کے ایسے آزمائشی دور میں غالب کی اہمیت و معنویت آج اور بڑھ جاتی ہے اور وہ ہمارے سامنے ایک نئے پیغام، نئی فکر کے ساتھ آتے ہیں۔ ایک ایسی فکر جو دشت و صحرا میں تو امکانات کے تصور پیدا کرتی ہی تھی نیز ہنگامیت، صارفیت سے بھری پری آج کی دنیا میں بھی انسانی عظمت و حرمت کے لالہ و گل کھلانے کی قوت نمو رکھتی ہے۔ بس ذرا ایک نئی دریافت کی ضرورت ہے۔

○○

ڈاکٹر خالد جاوید

غالب اور عہد غالب کا فکری منشور

غالب کے عہد کے فکری منظر نامے پر کوئی گفتگو کرنے سے قبل ایسی بات کی وضاحت کردینا ناگریز ہے کہ غالب بہ ذات خود کوئی مفکر نہیں تھے۔ وہ ایک شاعر تھے۔ ایک شاعر کی فکر اور ایک مفکر میں بہت فرق ہوتا ہے۔ مفکر کو بہر حال ایک رسمی سے ڈسپلن کا ہمیشہ پابند رہنا پڑتا ہے۔ ڈسپلن کا کام پردے اٹھانا نہیں بلکہ پردے واری ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ مفکر کو اکثر بیشتر سیاست بھی ہائی جیک کرلیا کرتی ہے۔ پھر یہ پردے Ironcurtains میں بدل جاتے ہیں اور ہمیں یہ مشکل سے ہی معلوم ہو پاتا ہے کہ مارکس کو شیکسپیئر کے ڈرامے یا بالزاک کے ناول کسی درجہ پسند تھے۔

بہر خلاف اس کے، شاعری کی فکر ہمیشہ آوارہ ہوتی ہے۔ غالب کی شاعری میں فکر کی جتنی بھی جہات ہیں انھیں ایسی پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیئے، مگر معاشرے کا کوئی بھی حساس فرد اپنے عہدے کے فکری ذہنی رویوں کے اتار چڑھاؤ سے مکمل طور پر بیگانہ بھی نہیں رہ سکتا۔ پھر غالب تو ایک سچے شاعر تھے اور سچے شاعر کی حساسیت اپنے عہدے کے فکری منظر نامے سے اور اپنے عہد کے مصائب سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکتی۔ غالب انیسویں صدی کے شاعر تھے اور انیسویں صدی میں عالمی منظر نامے پر کئی فلسفوں، نظریات اور افکار کا جنم ہوا۔ ان میں بعض روایت شکن تھے اور بعض ایسے بھی جو روایتی اخلاقیات کی توسیع کہے جاسکتے تھے۔

انیسویں صدی کا زمانہ روشن خیالی اور عقلیت پرستی کا زمانہ ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول اور سرسید کے مضامین بھی اسی فکر سے متعلق ہیں۔

یہی زمانہ ساری دنیا میں مارکسی افکار کی گونج اور مقبولیت کا بھی ہے۔ مارکس سے پہلے انیسوی صدی میں رابرٹ اوون (Owen) نے یوروپ اور امریکہ میں معاشیاتی روشن خیالی کی بنیاد پر ایک کوآپریٹو تحریک قائم کی تھی جس میں تمام افراد کو آپس میں مل کر سرمایہ، نفع، مزدوری وغیرہ کو

باہمی تعاون اور اشتراک کے ساتھ طے کر کے تقسیم کرنا تھا۔ انیسویں صدی کے وسط میں ہی فرانسیسی مفکر نے ذاتی ملکیت کی مخالفت کی تھی اور ہر قسم کی جائیداد کو چوری کا نام دے کر فلسفیانہ انارکزم کی بنیاد ڈال دی تھی۔ فرانس کے ہی اپنے فلسفی سینٹ سائمن کے وہ خیالات انیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں ساری دنیا میں مقبول ہو رہے تھے جو ایک جدید انقلاب کی بنیاد ڈالنے میں بہت مددگار ثابت ہو رہے تھے۔ سینٹ سائمن ایسی سماجی تنظیم کی تشکیل کرنا چاہتا تھا جس میں عیسائیت اس اقتصادی عمل کے لیے ایک بہت بڑی قوت ثابت ہو سکتی ہے جس کے ذریعے جنگ اور غریبی کو دور کیا جا سکتا ہے۔ یعنی مذہبی روحانی اخلاقیات کی مادیت کے ساتھ پیوندکاری کی جاسکتی ہے۔ انیسویں صدی کے عہد ساز مفکر اور فلسفی مارکس کی بڑائی اس بات میں ہے کہ اس نے اپنے فلسفے کا اطلاق زندگی کے ہر شعبے پر کیا۔ اسی لیے اس کے فلسفے کو Scientific Socialism کا نام دیا گیا۔ مارکس کے فلسفے میں سائنس اور جدید خیالات و نظریات کی آمیزش کے سبب پرانے عقائد اور القابات اور قدریں ختم ہوگئیں۔ پرانی قدروں کی ٹوٹ پھوٹ نے نئی قدروں کی تلاش کی طرف مائل کیا۔ مارکس کا فلسفہ عینیت پرستوں کے خلاف ایک ردعمل کے بطور پروان چڑھا ہے۔ ہمیں یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ عقلیت کے جس فلسفے کا آغاز ڈیفارٹ سے ہوا تھا وہ ہیومر تک پہونچتے پہونچتے ایک قسم کی تشکیک میں تبدیل ہو چکا تھا۔ جبکہ مارکس نے ان تمام فلسفوں کو اس لیے در کر دیا کہ وہ جدلیاتی نہ تھے سپاٹ تھے اور ان کا ایک ہی پہلو تھا وہ خارجی دنیا سے اثر قبول کرتے تھے مگر خارجی دنیا پر اثر انداز نہ ہوتے تھے۔ اس کی تبدیلی میں مددگار نہ ہوتے۔ مارکس نے حقیقت کو جدلیاتی مانا اور نامیاتی بھی۔ اس لیے حقیقت ارتقا کی طرف بھی مائل ہے۔ مارکس فلسفے کا دوسرا اور اہم عنصر اس کا Humanism ہے۔ تاریخ کا خالق انسان ہے اور اس عمل میں خودمختار ہے۔ یوں مارکس نے مادیت اور عقلیت کے ساتھ ساتھ ایک حقیقت پسند فلسفے کی بھی داغ بیل ڈالی دی۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ غالب تک ان فلسفوں کی کتنی رسائی تھی مگر یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے عہد کی آہٹوں سے بے خبر تھے، غالب فطری طور پر ایک جدید ذہن کے مالک تھے اور اپنے زمانے کی

معاشی، اخلاقی اور سماجی کروٹوں کے بعض ارتعاشات کو وہ پوری طرح نہیں تو جزوی طور پر جذب کرنے کے اہل تو تھے ہی۔ یہ دور ویسے بھی اردو زبان وادب کے نشاۃ ثانیہ کا ہے اور مختلف شعبہ ہائے علوم میں ترجموں کی ابتدا کا بھی۔ اس لیے غالب کے یہاں بیشتر اشعار میں تشکیک اور سوال کے لطیف عناصر ہمیں نظر آجاتے ہیں۔ مثلاً

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ابر کیا چیز ہے ، ہوا کیا ہے؟

یا ۔

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟ بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

ایک لطیف قسم کی مادیت پرستی انھیں اس قسم کے اشعار کہنے پر بھی مجبور کرتی ہے۔

غارت گر ناموس نہ ہو ہوس زر کیوں شاہد گل باغ سے بازار میں آوے

یا ۔

جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا کریدتے ہو جو اب راکھ، جستجو کیا ہے

یا پھر قصیدے کا یہ شعر۔

لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم دردیک ساغر غفلت ہے، چہ دنیا و چہ دیں

اس طرح غالب کے ان اشعار کو جنہیں محض شوخی کا اظہار سمجھ کر ٹال دیا جاتا ہے وہ ان کا تقلید پرستی کے رجحان کے خلاف ایک ردعمل کے طور پر بھی پڑھے جا سکتے ہیں۔ ان اشعار میں نئی اور پرانی قدروں کے تصادم اور روایت شکن کے عناصر واضح طور پر نظر کرتے ہیں۔ مثلاً ۔

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں ہانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

یا ۔

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے ہم بھی ایک اپنی ہوا باندھتے ہیں

یا ۔

کیا ہی رضواں سے لڑتی ہوگی گھر تیرا خلد میں گھر یاد آیا

یا ۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

یا ۔

طاعت میں تا رہے نہ مے وانگبیں کی لاگ دوزخ میں ڈال دو، کوئی لے کر بہشت کو

ان اشعار میں غالب کی انسان پرستی کا عنصر بھی نظر آتا ہے جو انیسوی صدی کے بیشتر افکار میں مرکزی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ یہ Humanism ہی غالب سے ایسے اشعار کہلوانے کو مجبور کرتا ہے کہ۔

دام ہر موج میں ہے، حلقۂ صد کام نہنگ دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

یا۔

قید حیات و بند غم، اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بری بلا ہے مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

یہاں مقصد اشعار کی فہرست ترتیب دینا نہیں ہے کیونکہ راقم الحروف کو، علم ہے کہ غالب کے یہاں ہر غزل سے دوسرے اور تقریباً متضادات مضمون پر بھی اشعار کی فہرست ترتیب دی جا سکتی ہے، مگر کیونکہ غالب کے عہد کا فکری منظر نامہ عقلیت پرستی، انسان پرستی روشن خیالی اور تشکیک کے عناصر ترکیبی سے مل کر ہی تشکیل پاتا ہے۔ اس لیے غالب کے یہاں ان مضمونوں میں بڑی قوت، برجستگی اور شدت ہے اور یہ بہت ہی فطری انداز میں بیان کیے گیے ہیں اور پھر یہ بھی ہے کہ غالب کی شاعری کے ساتھ ساتھ اگر ہم ان کی نثر بالخصوص خطوط کا مطالعہ کریں تو بھی ان کا یہ جدید ذہن وہاں اپنی عکاسی کرتا صاف نظر آتا ہے اور ان کی شخصیت و ذہن کے وہ گوشے پوری طرح روشن ہو جاتے ہیں، جن سے ان کی اپنے عہد کے فکری نظام کی نسبت رہی ہے مگر شاعری کیونکہ ان کے تخلیقی ذہن کی بنیادی شناخت ہے اور شاعری کے ذریعے ہی ان کی تہہ دار اور پیچیدہ تخلیقت کا اظہار ہوتا ہے اس لیے اس گفتگو کو سر دست غالب کی شاعری تک ہی محدود رکھا جا رہا ہے۔

غالب کی انسان پرستی (Humanism) انھیں وجودیت کے فلسفے سے بھی قریب تر کر دیتی ہے بلکہ ان کی شاعری کی ساری قوت ان کی وجودیت میں پنہاں ہے۔ ظاہر ہے کہ غالب نے باقاعدہ طور پر وجودیت کے فلسفے کا کوئی مطالعہ نہیں کیا تھا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم عام طور پر وجودیت کے فلسفے کو پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے اثرات کا پیدا کردہ ہی سمجھتے ہیں، مگر دراصل ایسا

نہیں ہے۔عہد نامۂعتیق سے لے کر اپنشدوں اور بدھ کے فلسفے میں ایسے بے شمار رجحانات مل جائیں گے جن کا ہر سرا کسی نہ کسی طرح وجودیت سے جاملتا ہے۔لیکن انیسویں صدی میں ہی مشہور مغربی فلسفا سورین کیر کے گار" نے جدیدیت کا فلسفہ پیش کر کے ساری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔اس طرح عہد غالب کے فکری منشور مین عقلیت روشن خیالی اور حقیقت پسندی کے ساتھ ساتھ وجودیت کی فکری بنیادی بھی شامل ہوگئی تھیں۔ غالب اس وجودیت کی طرف تصوف کے راستے سے شامل نہیں ہوتے ہیں، بلکہ وہ اس کائنات میں، انسان کے قائم رہنے اور اس کے ہونے کے تجربے کے ادراک کے نتیجے میں وجودی فلسفے کے قریب تر ہوتے چلے گئے ہیں۔یوں دیکھا جائے تو غالب کا ذہن انیسویں صدی کے فکری رویوں کو جذب کرتے ہوئے انیسویں صدی کے جدید ذہن کے مماثل ہوجاتا ہے جو اپنے آپ میں ایک بہت اہم بلکہ غیر معمولی واقعہ ہے۔

وجودیت کے فلسفے پر تفصیلی گفتگو سے گریز کرتے ہوئے صرف اتنی وضاحت ضروری ہے کہ وجودیت انسان کے جوہر کو صرف ایک تجربہ یا تو تصور سمجھتی ہے اس کا مرکز جیتا جاگتا انسان ہے۔ وجودیت ذات (Being) کا مسئلہ نہیں بلکہ "ہونے" Becoming کا مسئلہ ہے۔ وجودیت عینیت اور جبر کے خلاف ایک زبردست ردعمل ہے۔اس کے مطابق انسان کا وجود اس کے تصور پر فوقیت رکھتا ہے۔ بیسویں صدی میں کامیو اور سارتر وغیرہ نے زندگی کا اور کائنات میں جاری و ساری جس لغویت (Abdurdity) کی طرف اشارہ کیا ہے۔غالب نے اسے بہت پہلے ہی اپنی ذات اور کائنات کے حوالے سے سمجھ لیا تھا۔انسان کے وجود کی ایک معتبر شناخت کی تشکیل ہوتے رہنا غالب کی شاعری میں جگہ جگہ ایک سراغ کی صورت میں نظر آتا ہے مثلاً

میں اور ایک آفت کا ٹکڑا، وہ دل وحشی نہ ہے　　عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

وجودی تجربے سے مالا مال یہ شعر ایک قسم کی داخلی خود کلامی ہے۔غالب کا مکالمہ اپنی روح کے ساتھ ہے۔روح سے مکالمے کا امکان تب ہی پیدا ہوتا ہے جب انکشافات ذات ہوئے عرصہ گزر چکا ہو۔اس کے بعد کائنات کی تمام لغویت اور ناہمواری شاعر کے سامنے آشکار ہوجاتی ہے جس کی تمام جہات جن کی نوعیت، اخلاقی، معاشی اور سیاسی بھی ہوسکتی ہیں۔ انیسویں صدی کا زمانہ

ہندوستان میں اخلاقی، سیاسی اور معاشی اور تہذیبی طور سے بھی اتھل پتھل کا زمانہ تھا اور غالب میں اپنے عہد سے آنکھیں ملانے کی پوری جرأت اور طاقت تھی۔ یہ اشعار دیکھئے۔

جان دی ، دی ہوئی اس کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

یا۔

اے عافیت کنارہ کر، اے انتظام چل سیلاب گریہ درپیے دیوار ودر ہے آج

یا۔

عجب نشاط سے، جلاد کے چلے ہیں ہم آگے کہ اپنے سائے سے سر، پاؤں سے ہے دو قدم آگے

یا۔

میری تعمیر میں، مضمر ہے اک صورت خرابی کی ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

یا۔

میں تو دیوانہ ہوں اور ایک جہاں ہے غماز گوش ہے درپس دیوار، کہوں یا نہ کہوں

یا۔

کہاں تک روؤں اس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے میری قسمت میں یارب، کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

وجودی تجربے سے مالا مال ہونے کی وجہ سے غالب کی شاعری روایتی انداز میں محض خیال کی شاعری نہیں ہے۔ غالب کے یہاں ایک غیر جذباتی معنی کی گونج، ذات اور کائنات اور لفظ تینوں کی پیوندکاری اور حرکیات کی جھلک دکھا کر خاموش ہو جاتی ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ غالب نہ تو کوئی صوفی ہیں نہ مفکر، نہ فلسفی اور سائنس داں لیکن وہ ایک ایسے غیر معمولی ذہن کے مالک ہیں جو اپنے عہد کی نظری اور فکری اساس سے ہی تشکیل پاتا ہے۔ روایت کی تقلید ماضی پرستی، محض تجریدیت وغیرہ غالب کے یہاں خال خال ہی نظر آتی ہے اور وہ بھی غزل کی صنف کی مجبوری کی وجہ سے۔ ان کی شاعری میں تصوف سے متعلق مضامین کی آمیزش بھی بڑی غلط فہمی پیدا کرتی ہے۔ یہ وہ مضامین ہیں جو رسمی طور پر فارسی اور اردو شاعری میں تقریباً ہر ایک کے یہاں وافر مقدار میں مل جائیں گے۔ مگر وہ خاص لہجہ، وہ منفرد اسلوب اور ان کی داخلی خودکلامی ان مضامین کو داخلی سطح پر دوسروں سے مختلف بنا دیتی ہے۔ ان مسائل اور مضامین کی طرف غالب کا ردعمل دوسرے قسم کا ہے

اور وجودیت کی دانشورانہ روایت کے تقریباً تمام نقوش بہت فطری طور پر اپنے عہد کے فکری منظر نامے سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے، غالب کے یہاں چلے آئے ہیں۔

نہ گل نغمہ ہوں، نہ پر دۂ ساز　　میں ہوں اپنی شکست کی آواز

یا ـ

مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں　　ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

یا ـ

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو　　توڑا جو تو نے آئینہ، تمثال دار تھا

اشعار کی تعداد بہت طویل ہو سکتی ہے۔ اس سے گریز کرتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ غالب ایک منطقی ذہن کے مالک تھے۔ عقلیت پسندی اور سائنسی طرز فکر ان کی بنیادی شناخت ہے۔ مذہب کی رسمی قسم کی گروہ بندی میں بھی ان کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ انسان دوستی (Humanism) میں یقین رکھتے تھے اور ان کی نام نہاد تجریدیت بھی اپنے اندر بہت ہی لطیف قسم کی مادیت کے جوہر پوشیدہ رکھتی ہے۔ مثلاً

صبح قیامت اک دم گرگ تھی اسد　　جس دشت میں وہ شوخ دو عالم شکار تھا

جیسا کہ گزشتہ سطروں میں عرض کیا گیا ہے کہ انیسویں صدی کا زمانہ بہت سے فلسفیانہ افکار و نظریات کی تشکیل کا زمانہ تھا۔ عقلیت پسندی، تشکیلیت، مادیت، سائنسی مزاج، انسان دوستی، آزردہ روی، روایت سے انحراف اور وجودی نقطہ نظر سب مل کر اس عہد میں ایک کولاج تیار کر رہے تھے۔ غالب کی شاعری میں یہ کولاج ہمیں صاف طور پر نظر آتا ہے اور یہی سبب ہے کہ وہ اپنے عہد کے دوسرے شعرا کے مقابل بالکل مختلف اور منفرد مقام کے حامل ہیں۔

غالب نے اپنے بارے میں غلط نہیں کہا تھا۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے

جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

○○

جاوید رحمانی

غالب اور اٹھارہ سو ستاون

یادگار غالب پہلی مرتبہ 1897 میں شائع ہوئی۔ حالی اس سے پہلے 'مقدمہ شعر و شاعری' جیسی معرکہ آرا کتاب لکھ چکے تھے۔ یادگار غالب غالب کی شخصیت اور فن پر پہلی باضابطہ کتاب ہے اور غالب پر لکھی جانے والی کتابوں میں اب تک کوئی ایسی کتاب نہیں۔ یادگار غالب جیسی شہرت اور مقبولیت جس کے حصے میں آئی ہو۔ یادگار غالب کے سرورق پر لکھی یہ عبارت درج تھی:

''مرزا اسداللہ خاں غالب کی زندگی حالات اور ان کی نظم و نثر اردو و فارسی کا انتخاب اور ہر ایک قسم پر جداگانہ ریمارکس''

لیکن دیباچے میں حالی نے لکھا ہے:

''مرزا کی لائف میں کوئی منوہ بالشان واقعہ ان کی شاعری و انشا پردازی کے سوا نظر نہیں آتا۔ لہٰذا جس قدر واقعات ان کی لائف کے متعلق اس کتاب میں مذکور ہیں۔ ان کو ضمنی اور استقراری سمجھنا چاہیے۔ اصل مقصد اس کتاب کے لکھنے سے شاعری کے عجیب و غریب ملکے کا لوگوں پر ظاہر کرنا ہے، جو خدا تعالیٰ نے مرزا کی فطرت میں ودیعت کیا تھا اور جو کبھی نظم و نثر کے پیرایے میں، کبھی ظرافت اور بذلہ سنجی کے روپ میں، کبھی عشق بازی اور رند مشربی کے لباس میں اور کبھی تصوف اور حب اہل بیت کی صورت میں ظہور کرتا تھا۔ پس جو ذکر ان چاروں باتوں سے علاقہ نہیں رکھتا، اس کو کتاب کے موضوع سے خارج سمجھنا چاہیے۔''

یہ بیان حالی کے سر سید تحریک سے تعلق کا مظہر ہے جو ان کی بنیادی فطرت سے علاقہ نہیں رکھتا۔ ڈاکٹر نیر مسعود نے لکھا ہے:

لہٰذا حالی کے نقطۂ نظر سے مناسب طریق کار یہی تھا کہ غالب کے اس واحد کارنامے پر زیادہ سے زیادہ روشنی ڈالیں اور بر سبیل تذکرہ ان کی زندگی اور شخصیت کا بھی ایک خاکہ

پیش کردیں۔ آج یادگار غالب میں سب سے زیادہ اہمیت غالب کی سوانح عمری کی ہے،
اس کے بعد ان کی اردو نظم ونثر پر تبصرہ اور اس کے بعد ان کی فارسی نظم ونثر پر تبصرے کا
درجہ ہے لیکن خود حالی کی نظر میں کتاب کے اہم عناصر کی یہ ترتیب معکوس تھی۔"

حالی کا خیال تھا کہ "اس ملک میں مرزا پر فارسی نظم ونثر کا خاتمہ ہوگیا اور اردو نظم ونثر پر بھی ان کا کچھ کم احسان نہیں ہے۔" چنانچہ انھوں نے اپنی ساری توجہ اسی پر مرکوز رکھی اور سوانحی حصے پر کم سے کم توجہ دی۔ حالی نے یہ کتاب گو بہت سرسری طور پر لکھی جس کے متعدد شواہد خود اس کتاب میں حالی کے بیان کی شکل میں موجود ہیں لیکن حالی نے جو سوانح عمریاں لکھیں ان میں یادگار غالب سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ اس کتاب میں حالی نے محمد حسین آزاد سے بہت استفادہ کیا۔ اور ان پر بہت کچھ لکھا بھی گیا ہے حالانکہ ابھی تک بہت سے لوگ "آب حیات" میں غالب کے بارے میں محمد حسین آزاد کے بیانات کو معاندانہ رہی سمجھتے ہیں۔ جبکہ غالب کے سلسلے میں محمد حسین آزاد کے جو بیانات تحقیقی اعتبار سے غلط ٹھہرائے گئے ہیں ان میں سے بیشتر غلطیاں دراصل محمد حسین آزاد کی غلطیاں نہیں بلکہ منشی ذکاء اللہ اور علاء الدین کے بیان کی غلطیاں ہیں جن کو ایک سوالنامہ بھیج کر محمد حسین آزاد نے غالب کی زندگی سے متعلق نو اہم سوالات کے جواب چاہے تھے۔ یہ خطوط مع جوابات دستیاب ہیں، مجھے غالب کے تعلق سے محمد حسین آزاد کے بیانات معاندانہ یوں بھی نہیں لگتے کہ میرے خیال میں اگر محمد حسین آزاد کا مقصد غالب کی شخصیت کو مجروح کرنا ہوتا تو اس کا سب سے آسان طریقہ یہ تھا کہ وہ منشی ذکاء اللہ کے بیانات کو نقل کردیتے۔ جو انھوں نے نہیں کیا۔ محمد حسین آزاد نے جو سوالنامہ ان لوگوں کو بھیجا وہ غالب کی پوری زندگی سے متعلق تھا۔ یوں حالی نے بھی 'یادگار غالب' میں نواب سعید الدین احمد خاں، سید اکبر مرزا، سید مظفر مرزا، میر مہدی مجروح اور لالہ بہاری لال مشتاق کے بارے میں لکھا ہے کہ ان سے مرزا کے حالات دریافت کیے۔ اس بارے میں قاضی عبدالودود نے لکھا ہے:

"اس وقت بہت سے لوگ جو غالب اور ان کے خاندان سے واقفیت رکھتے تھے، زندہ
تھے، مگر انھوں نے غالب کے حالات دریافت کرنے کے لیے انتخاب کیا تو
صرف 5 اشخاص کو جو کم وبیش انھیں کی عمر کے تھے، اور مجھے یقین ہے کہ حالی نے انھیں
بھی سوالات نہ بھیجے ہوں گے، بس یہ لکھا ہوگا کہ جو آپ کے علم میں ہو بتایئے۔"

ص 50-58 مقالہ افتتاحیہ، بین الاقوامی غالب سیمینار۔

قاضی عبدالودود کا یہ خیال درست ہوتا ہے کہ حالی نے ان اشخاص کو سوالنامہ تک بھیجنے کی زحمت گوارا نہ فرمائی ہوگی جبکہ آزاد نے آب حیات (مطبوعہ 1880) کے لیے تقریباً ایک درجن سوالات ان اشخاص کو بھیجے جن سے توقع تھی کہ غالب کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں جبکہ ان کی کتاب کئی شعرا کے حالات کا نگار خانہ تھی اور حالی کی مکمل کتاب صرف اور صرف غالب کی شخصیت اور نظم ونثر سے متعلق تھی اس کے باوجود حالی کے یہاں آزاد جیسی کاوش کا سراغ نہیں ملتا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے حالی کے تقریباً نو بیانات ایسے نقل کیے ہیں جو آزاد کی آب حیات سے لیے گئے ہیں۔

ان میں کم ازکم تین بیانات ایسے ہیں جو تاریخ سے متعلق ہیں اور ان کے لیے حالی نے کسی تاریخی کتاب یا خود مرزا کی تحریر کا حوالہ نہیں دیا تو لامحالہ اسے آزاد سے ماخوذ تسلیم کرنا پڑے گا۔ کاظم علی خاں نے بھی یادگار غالب میں آب حیات کی جلوہ گری کی دس مثالیں پیش کی ہیں اور غالبیات میں محمد حسین آزاد کی 'اولیات' کی آٹھ مثالیں درج کی ہیں جن میں سے دو یہ ہیں۔

(1) غالب کی شخصیت کو لطائف وظرائف کی مدد سے ابھارنا

(2) خطوط غالب سے غالب کی سوانح اخذ کرنا

اور یادگار غالب میں حالی نے ان دونوں سے بہت کام لیا ہے چنانچہ طریقۂ کار کی سطح پر بھی یاد گار غالب پر آب حیات کا اثر اتنا نمایاں ہے کہ اس کی تلاش کے لیے زیادہ محنت کی ضرورت نہیں۔ آزاد کی 'آب حیات' سے پہلے کسی نے غالب کی شخصیت کو لطائف وظرائف کی مدد سے ابھارنے کی کوشش کی نہ خطوط غالب سے غالب کی سوانح اخذ کرنے کی۔ چنانچہ اگر یادگار غالب پر آب حیات کے اثرات کی نشاندہی کی جاتی ہے تو اس کے لیے شرمندہ ہونے اور اس کی لایعنی تاویل کی کوئی ضرورت نہیں۔ یادگار کا وہ حصہ زیادہ تفصیلی ہوگیا ہے جو نظم ونثر سے متعلق ہے تو اس لیے کہ ''حالی کا ذہن تنقیدی مباحث سے جیسی قریب کی نسبت رکھتا تھا، تحقیقی مباحث سے ان کے مزاج کو ویسا علاقہ نہیں تھا'' (رشید حسن خاں)۔ چنانچہ حالی کی یادگار غالب کا سوانحی حصہ کمزور ہے۔ اس میں ''حالات غدر'' بھی انتہائی اختصار کے ساتھ درج کیے گئے ہیں اور اس بیان میں بھی

غلطیاں ہیں۔حالی لکھتے ہیں:

”غدر کے زمانے میں مرزا دلی سے، بلکہ گھر سے باہر نہیں نکلے۔ جوں ہی بغاوت کا فتنہ اٹھا انھوں نے دروازہ بند کرلیا اور گوشہ تنہائی میں غدر کے حالات لکھنے شروع کیے۔“ص48 یادگار غالب

اس پر قاضی عبدالودود کا یہ تبصرہ درست ہے کہ ”یہ صرف شورش کے آخری ایام کے متعلق صحیح ہوسکتا ہے۔“ حالات غدر کے حصے میں ہی حالی نے مرزا کے بھائی مرزا یوسف کے انتقال کا ذکر یوں کیا ہے:

”ایک دن وہی بڈھا دربان جو مرزا یوسف کی ڈیوڑھی پر رہتا تھا، یہ خبر لایا کہ پانچ روز سخت تپ میں مبتلا رہ کر آج آدھی رات گزرے، مرزا یوسف کا انتقال ہوگیا“ ص49 یادگار غالب

جبکہ مرزا یوسف کی وفات 18-19 اکتوبر 1857 کو انگریز کی گولی سے ہوئی۔

انیسویں صدی کو پروفیسر شمیم حنفی نے تخلیقی طور پر اضمحلال کی صدی کہا ہے اور یہ واقعتاً ہندوستان کی تمام زبانوں کے لیے اضمحلال/زوال کی صدی ہے۔ اس صدی میں غالب کی شخصیت ایک روشن نقطے کی حیثیت رکھتی ہے۔شمیم حنفی لکھتے ہیں:۔

”انگریزی حکومت کے قیام کے ساتھ ہندوستانی معاشرے پر بتدریج ایک غیر دلچسپ قسم کی نثریت کا غلبہ بڑھتا گیا۔اردو میں تو حالت پھر بھی غنیمت کہی جاسکتی ہے کہ معاملہ افادی ادب کے تصور تک پہنچ کر ٹھہر گیا تھا۔پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اس صدی کے پورے شعری منظر نامے پر غالب کا سایہ دور تک پھیلا ہوا ہے۔لیکن دوسری زبانوں میں رفتہ رفتہ شعر و ادب کے نام پر ایک مستقل سستا پن حاوی ہوتا گیا۔ چنانچہ ہندوستانی ادبیات کی تاریخ میں، مغرب سے ماخوذ اسالیب، اصناف اور تصورات کی چمک دمک کے باوجود، مغربی افکار کے سایے میں سانس لیتی ہوئی انیسویں صدی تخلیقی قوتوں کے اضمحلال اور زوال کی صدی ہے۔“(1)

غالب کی شخصیت کئی لحاظ سے اس صدی کی سب سے نمائندہ شخصیت ہے۔حالی نے یونہی غالب کے مرنے کو دلی کے مرنے سے تعبیر نہ کیا تھا! سجاد باقر رضوی نے لکھا ہے کہ ”غالب برصغیر کی تقریباً ہزار سالہ مسلم تہذیب کا استعارہ ہیں ایسا ہی استعارہ جیسا کہ امیر خسرو تھے امیر خسرو کا تعلق دور عروج سے تھا مرزا غالب کا دور زوال سے۔“(2) اور عروج و زوال کا یہ کھیل دلی کے ام

میدان میں کھیلا گیا اس کا مرکزِ ثقل دلی تھی۔ اسی لیے اس پوری کہانی کے نشیب وفراز کو دلی کے حوالے ہی سے سمجھا جا سکتا ہے اور غالب کی ذات اس دلی کا ایسا اہم حصہ تھی کہ حالی نے اس کے مرنے کو دلی کے مرنے سے تعبیر کیا ہے۔

غالب کو وہ زمانہ ملا کہ مغلوں کی تلوار ٹوٹ چکی تھی اور ان کی ساری توجہ کھیل تماشے اور تفریحات وتقریبات پر مرکوز ہوگئی تھی اسی زمانے کے لیے کہا جاتا ہے کہ یہاں آٹھ دن نو میلے تھے۔ زندگی کا کوئی نصب العین نہ تھا سید ضمیر حسن دہلوی نے صحیح لکھا ہے کہ ''اس زمانے کی دلی کا یہ عالم تھا کہ سلطنت کو گھن لگ چکا تھا اکبر شاہ ثانی چولھے آگ نہ گھڑے پانی بچے بچے کی زبان پر تھا مگر وہ جو اگلی دولت کی فراوانی نے بزم آرائی کے خط وخال میں نفاست اور نزاکت بھر رکھی تھی وہ البتہ ضرور قائم تھی۔۔۔ مذہبی رسوم موسمی تہواروں اور شادی وغمی کو تقریبات کا بہانہ بنا لیا گیا تھا۔''(3) اور مغل تہذیب تو یوں بھی نفاست ونزاکت اور حسن و جمال کی تہذیب تھی جب اس سے جلال رخصت ہوا تو ساری توجہ جمال پر مرکوز ہونی ہی تھی چنانچہ مرزا کے عہد میں ایسا ہی ہوا اور لال قلعہ کی مرکزیت یوں تو پارہ پارہ ہو چکی تھی لیکن ایک ادبی وتہذیبی ادارے کی حیثیت اسے اب بھی حاصل تھی۔ اگر چہ کتنی دیر؟ کہنا مشکل تھا قاضی عبدالجمیل کو غالب نے لکھا کہ '' مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا قلعہ میں شہزادگان تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزل خوانی کر لیتے ہیں وہاں کے مصرعۂ طرح کو کیا کیجیے گا اور اس پر غزل لکھ کر کہاں پڑھیے گا میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا اور یہ صحبت خود چند روزہ ہے اس کو دوام کہاں کیا معلوم ہے ابھی نہ ہو اب ہو تو آئندہ نہ ہو۔''(4)

غرض ایسی غیر یقینی صورت حال تھی کہ کچھ بھی قیاس نہیں کیا جا سکتا تھا اور یہ صورت اچانک نہیں پیدا ہوئی تھی پروفیسر نثار احمد فاروقی نے لکھا ہے۔ ''غالب نے جب ہوش سنبھالا تو سلطنت مغلیہ حواس باختہ ہو چکی تھی اور مرہٹوں جاٹوں یا سکھوں کی طاقت بھی کوئی ایسی بنیاد نہیں رکھتی تھی جو مغلیہ حکومت کا متبادل فراہم کر سکے ایک نئی غیر ملکی طاقت کمپنی بہادر کی البتہ اپنی جڑیں گہرائی میں جما چکی تھی اور مشرق سے شمال مغرب کی طرف بڑھتی چلی آتی تھی۔''(5) یہاں پر اس قدر اضافہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مرہٹوں اور جاٹوں نے ہی انگریزوں کے تسلط کے لیے راستہ ہموار کیا

مغلوں کی حواس باختگی میں ان کا جو حصہ رہا ہے۔ اسے بھی ذہن میں رکھنا چاہیے۔ بہر حال یہ صرف دو گروہ یا دو جماعتوں کی سیاسی شکست و فتح کا کھیل نہیں تھا بلکہ دو تہذیبوں کی آویزش تھی جس کے عینی شاہد غالب تھے جو یہ شعور رکھتے تھے کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا اور غالب کی زندگی میں ہی یہ آویزش مکمل بھی ہوئی اور اس کا فیصلہ انگریزوں کے حق میں ہوا جو ایک طرح سے نئے نظام کی فتح ہے پرانے نظام پر۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ کم و بیش انھیں زمانوں میں قدیم وجدید کی آویزش عالمی منظرنامے پر بھی دکھائی دیتی ہے۔ جس کا یہاں ذکر ہمیں اپنے موضوع سے دور لے جائے گا اور قدرے غیر ضروری بھی ہے۔ دلی کا سیاسی اثر بتدریج کم ہوتا جا رہا تھا اور اس کا حال یہاں کے موسموں جیسا بڑی مدت سے تھا۔ کہتے ہیں دلی کا اپنا کوئی موسم نہیں تو مسلسل حملوں نے کم و بیش ایسی ہی صورت سیاسی سطح پر پیدا کر دی کہ دکن سے کوئی آندھی اٹھی تو اس کی زد میں لال قلعہ، پنجاب سے کوئی ہوا چلی تو دلی کا حال دگرگوں۔ لیکن انگریزوں کی مداخلت نے پوری بساط ہی الٹ دی۔ کوئی آندھی آتی تو گزر جاتی تھی، کوئی ہوا چلتی تو تھمتی بھی تھی 1803ء کے بعد تو مغل بادشاہت نہیں اس کا بھرم باقی رہا جو کچھ تو انگریزوں نے اپنی حکمت عملی کے تحت قائم رکھا اور کچھ مغلوں نے اپنی خود فریبی سے۔ شاہجہانی جاہ و جلال رخصت ہو چکا تھا اس کے سائے لرزاں تھے ان کی روایات قائم تھیں، جو تلخ حقیقت پر پردہ ڈال دیتی تھیں۔ اسی لیے پروفیسر خلیق احمد نظامی نے قلعہ کو ایک ایسے سراب سے تعبیر کیا ہے جس نے مدتوں حقیقت کا احساس نہ ہونے دیا۔ غالب کو حقیقت کا احساس تھا لیکن وہ مجبور محض تھے مغلوں کے سیاسی زوال کا مرقع پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ایک دلچسپ استعارے کی مدد سے اس طرح پیش کیا ہے کہ "جس جمنا کے کنارے کبھی ہاتھیوں کی لڑائیاں دیکھی جاتی تھیں وہاں اب ظل سبحانی بیٹروں کی لڑائیاں اور پتنگوں کے معرکے دیکھتے تھے۔" (6) اور ڈاکٹر پرسیول اسپیر کے خیال میں اس زمانے کے ادبی معرکوں کی بھی کیفیت یہی تھی یہ بھی مغل فرمانرواؤں کی خود فریبی کا بہانہ تھے جس میں بہادر شاہ چونکہ خود بھی شاعر تھے تو ایک فریق کی حیثیت سے بھی شامل تھے اور ان بہانوں سے ادبی و تہذیبی مرکزیت قائم تھی۔ حالی نے لکھا ہے:

"تیرہویں صدی ہجری میں جبکہ مسلمانوں کا تنزل درجۂ غایت کو پہنچ چکا تھا اور ان کی دولت عزت اور حکومت کے ساتھ علم و فضل اور کمالات بھی رخصت ہو چکے تھے حسن

اتفاق سے دارالخلافہ دہلی میں چند اہل کمال ایسے جمع ہو گئے تھے جن کی صحبتیں اور جلسے عہد اکبری وشاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کو یاد دلاتی تھیں ـــ۔اگر چہ جس زمانے میں کہ پہلی بار راقم کا دلی جانا ہوا اس باغ میں پت جھڑ شروع ہو گئی تھی کچھ لوگ دلی سے باہر چلے گیے تھے اور کچھ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے مگر جو باقی تھے اور جن کے دیکھنے کا مجھ کو ہمیشہ فخر رہے گا وہ بھی ایسے تھے کہ نہ صرف دلی سے بلکہ ہندوستان کی خاک سے پھر کوئی ویسا اٹھتا نظر نہیں آتا"۔(7)

اس پر پروفیسر تنویر احمد علوی کا یہ تبصرہ بھی ملاحظہ فرمائیں" اصل میں مولانا حالی اس وقت کی دہلی کے سیاسی زوال اور اقتصادی کم مائیگی کا ذکر کرنا چاہتے ہیں ورنہ جہاں تک علمی کمالات اور ادبی فتوحات کا سوال ہے یہ دور خود مغل تاریخ کا ایک اہم عہد ہے اور اس شاندار عہد کے اہل علم ارباب زہد ورع اور اصحاب فکروفن میں ایسے ایسے منتخب روزگار افراد موجود ہیں کہ ان میں سے ہر فرد گویا اپنی ذات میں ایک انجمن ہے۔۔۔ یہ تھی عہد غالب کی دلی جس کی محراب زندگی قوس قزح کی طرح ہفت رنگ تھی اور جس کے افقی دائرے میں غالب کے فکروفن کو نمو پذیر ہونے اور فروغ پانے کا موقع ملا"۔(8)

اس دلی میں امراء کے دیوان خانے آج کل کی طرح نہیں تھے وہ اعلیٰ علمی وادبی ذوق ومعیار کی نمائندگی کرتے تھے اسی لیے سر سید انھیں حسرت سے یاد کرتے ہیں اور پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ہر عالم اور امیر کے گھر کو ایک علمی مرکز قرار دیا ہے اور شبیر احمد خاں غوری شاہ عبدالعزیز کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اس میں اتنے مدارس ہیں کہ کوئی گشت لگائے تو اس کو ہر جگہ کتابیں ہی کتابیں نظر آئیں گی، اس زمانے کی دلی نہ صرف علمی بلکہ ثقافتی رنگارنگی کی بھی نادرالوجود مثال تھی اس میں کیسے کیسے مختلف اور متضاد رنگ سما گئے تھے اس کا اندازہ آسان نہیں اور اس کی بڑی حد تک نمائندگی غالب کے حلقۂ احباب سے بھی ہوتی ہے جس میں رند اور صوفی سبھی شامل ہیں اس دلی میں ایک طرف مدارس اور خانقاہوں کا جال بچھا ہے تو دوسری طرف رقص وسرور، عیش وانبساط اور ہنگامہ ہائے ناونوش بھی ہے اور ایک کی اخلاقیات دوسرے کو زیر نہیں کرتی۔ ایسی ایسی خانقاہیں، جہاں بیرونی ممالک سے بھی عقیدت مند آتے ہیں اور فیض حاصل کر کے لوٹ جاتے ہیں۔ مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی نے ندوۃ العلماء کے بانی مولانا علی مونگیری سے کہا کہ" ہم نے عشق کی دو دکانیں دیکھی ہیں ایک شاہ غلام علی کی اور دوسری حضرت شاہ محمد آفاق رحمۃ اللہ علیہ کی، کہ اس

دکان میں عشق کا سودا بکا کرتا تھا'' (بحوالۂ خلیق احمد نظامی) اور ایسی متعدد دکانیں موجود تھیں گو اتنی بڑی نہیں۔ انھیں میں کالے صاحبؒ کی خانقاہ بھی شامل تھی جن سے غالب بھی عقیدت ومحبت کا رشتہ رکھتے تھے۔ غالب نے ان دکانوں سے سودا نہیں خریدا اور اپنی افتادِ طبع کے لحاظ سے وہ ایسا کر بھی نہیں سکتے تھے تاہم اس بازار میں ان کی عمر تو گزری۔ اسی کے ساتھ متعدد علمی و اصلاحی تحریکیں بھی سرگرمِ عمل تھیں بے شمار کلب پتنگ اڑانے کے، تیرنے کے اور تیز اندازی کے۔ اور اس بازار، ان تحریکات اور ان کلبوں کا دائرۂ اثر اتنا وسیع تھا کہ ان میں شریک ہونے والے وہ ہندو بھی دکھائی دیتے ہیں جنھیں اللہ غنی، اللہ اکبر، بسم اللہ اور یا علی کہنے میں عار نہ تھا اور ایسے مسلمان بھی جو ہندوانہ رسموں کو ادا کرتے شرماتے نہیں تھے اور اسی لیے مولوی سید احمد دہلوی نے اپنی کتاب ''رسوم دہلی'' شروع ہی ان الفاظ سے کی ہے ''مسلمانوں کی عورتوں اور ان کے سبب ان کے مردوں میں جس قدر رسمیں مروج ہیں وہ تقریباً سب کی سب ہندوانی رسمیں ہیں جن میں بہت سی رسمیں جوں کی توں ہیں بعض کے نام تو وہی ہیں مگر طریقے بدل گئے ہیں بعض میں برائے نام فرق کر دیا ہے بعض کو مذہبی امور میں بہ تغیر نام شامل کر لیا ہے۔''(9) اکبر کے عہد تک آتے آتے شاہی خاندان کے مذہبی معاملات میں اتنی لچک آگئی تھی کہ جو شاہزادہ تخت کا حقدار سمجھا جاتا وہ ختنہ نہیں کراتا۔ اس طرح کی ثقافتی رنگارنگی کے بے شمار مظاہر اور انھیں فروغ دینے والے ادارے بکھرے پڑے تھے جن کا قدرے تفصیل سے ذکر خلیق احمد نظامی نے کیا ہے جو غالب کی دلی کے رنگ و آہنگ کو ظاہر کرتے ہیں اور کسی کا اس سے بیگانہ محض رہنا ممکن ہی نہ تھا۔ مولانا حالی نے سر سید کی جرأت اور بیباکی کا سرچشمہ وہابی علماء کی تحریر اور طرزِ فکر کو بتایا تھا تو خواجہ احمد فاروقی نے لکھا کہ ''وہابی علماء اور مرزا غالب کے راستے الگ الگ تھے لیکن جس آزادی اور بے باکی سے ان علماء نے مذہب رسوم اور معاشرت میں تقلید کے خلاف جہاد کیا اور اصنامِ خیالی کو توڑا۔ اسی آزادی سے مرزا غالب نے فنِ لغت اور فنِ شعر میں بڑے بڑے استادوں پر نکتہ چینی کی ہے اور اس بات پر زور دیا کہ اگلے جو کچھ کہہ گیے ہیں وہ وحی اور الہام نہیں ہے اور نہ ہر پرانی لکیر صراطِ مستقیم ہے۔''(10) اور یہ بات بہرحال جی کو لگتی ہے کہ غالب میں تقلید سے بیزاری اور روایت شکنی کا جو مادہ تھا اسے وہابی تحریک کا فیض کیوں نہیں کہا جا سکتا! حالانکہ غالب بذاتِ خود کہاں تک صراطِ مستقیم پر تھے خصوصاً فنِ لغت کے سلسلے میں ایک الگ اور لمبی بحث کا موضوع ہے جس پر قاضی عبدالودود اور پروفیسر نذیر احمد صاحبان نے تفصیل سے لکھا ہے جن کا احاطہ یہاں ممکن نہیں وہ دلی جس کو یاد

کرتے ہوئے غالب لکھتے ہیں ''بھائی کیا پوچھتے ہو کیا لکھوں دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی قلعہ، چاندنی چوک، ہر روزہ مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا یہ پانچوں باتیں اب نہیں پھر کہو دلی کہاں۔ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔''

تو بیک وقت ہمارا ذہن دلی کے شاندار ماضی اور عبرت ناک حال کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

1857 کی بغاوت نے وہ تہذیبی بساط ہی الٹ دی۔ 1857ء کی بغاوت جتنی تیزی سے پھیلی اتنی ہی تیزی سے ٹھنڈی بھی پڑ گئی۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی کی یہ رائے درست ہے:

''ہندوستان کی ایک بڑی بدنصیبی یہ تھی کہ پوری تحریک کو کسی ایک مرکزی تنظیم کے ماتحت نہ لایا جا سکا۔ مقامی اور انفرادی کوششوں نے ملک میں ابتری تو پیدا کر دی لیکن اس ابتری کو غیر ملکی اقتدار کے خلاف ایک منظم کوشش کے طور پر استعمال کرنا ممکن نہ ہوا۔ چار ماہ کی مدت میں دہلی میں کوئی ایسا نظام ترتیب نہ دیا جا سکا جو ایک کل ہند نظام کو اپنے اندر جذب کر لینے میں کامیاب ہو جاتا۔ اس بدنظمی کا ایک ایک بڑا سبب یہ تھا کہ تقریباً دصیوں سے ملک میں انتشار و ابتری کا دور دورہ تھا۔ جاٹ گردی، مرہٹہ گردی، نادر گردی اور نہ معلوم کن کن آفتوں نے سماجی زندگی کا توازن بگاڑ کر سیاسی نظام کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا تھا۔''(11)

خلیق احمد نظامی کا خیال ہے کہ انگریزوں نے جس سفاکی اور بے دردی سے خون بہایا تھا۔ اس سے دلوں پر خوف طاری ہو گیا اور کسی کو اس قیامت صغریٰ کی داستان مرتب کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں:

''کسی نے زیادہ جرأت سے کام لیا تو ڈائریاں اور روز نامچے مرتب کر دیے لیکن انگریزوں کے جبر و تشدد کی جوان مٹ کیفیت پیدا ہو گئی تھی اس کے آثار یہاں بھی نمایاں رہے اور تحریک کے جرأت مندانہ تجزیہ کی ہمت تو کیا، اپنے جذبات کے اظہار تک کی جرأت نہ ہوئی۔''(12)

وہ بتاتے ہیں کہ حقیقی جذبات وقتی مصلحتوں کے بوجھ میں اس طرح دب گئے کہ ان میں کافور و کفن کی بو تو سونگھی جا سکتی ہے لیکن کسی کے دل کی بے چین دھڑکنیں نہیں سنی جا سکتیں۔(13) تصویر کا ایک رخ یہ بھی ہے لیکن ایک دوسرا پہلو بھی ہے کہ ہم تک جو ڈائریاں اور روز نامچے پہنچے ہیں، جن میں خوشامد کی لے بہت تیز ہے، وہ طبقۂ اشراف کے ہیں اور اشرافیہ طبقے کے مفادات انگریزوں سے اس طرح وابستہ تھے کہ ان سے انگریزوں کے مظالم کی سچی تعبیر

وتشریح کی امید بہت کم کی جا سکتی ہے۔ ان کے لیے یہ بغاوت واقعتاً ''رستخیز بے جا'' ہی تھی جوان کے اور ان کے مربی کے درمیان شکوک وشبہات کی گہری خلیج حائل کرنے والی تھی۔ کچھ روز نامچے اور ڈائریاں تو صرف اس لیے لکھی گئیں کہ ان سے اس خلیج کو پاٹنے میں مدد مل سکے۔ 13/ جون 1857 کے سخت پریس ایکٹ کی روشنی میں یہ قیاس بھی غلط نہ ہوگا کہ کچھ منصفانہ روز نامچے اور ڈائریاں دستیاب ہو سکیں ان کا بے حد عمدہ تجزیہ خلیق احمد نظامی نے ''1857 کا تاریخی روز نامچہ'' کے مقدمے میں کیا ہے۔

غالب نے دستنبو کے نام سے جو روز نامچہ لکھا اس کی نوعیت کا اندازہ ان کے اس خط سے کیا جا سکتا ہے جو تفتہ کے نام ہے۔ غالب لکھتے ہیں:

> ''چھاپے کے باب میں جو آپ نے لکھا ہے، وہ معلوم ہوا۔ اس تحریر کو جب دیکھو گے تب جانو گے۔ اہتمام اور عجلت اس کے چھپوانے میں اس واسطے ہے کہ اس میں سے ایک جلد نواب گورنر جنرل بہادر کی نذر بھیجوں گا اور ایک جلد بذریعہ ان کے جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی نذر کروں گا۔ اب سمجھ لو کہ طرز تحریر کیا ہوگی؟ اور صاحبان مطبع کو اس کا انطباع کیوں نا مطبوع ہوگا؟''

اتنا ہی نہیں مجروح کے نام اکتوبر 1858 کا ایک خط ہے جس میں غالب بتاتے ہیں کہ صاحب مطبع نے ۔۔۔ آگرہ کے حکام کو دکھایا، اجازت چاہی۔ حکام نے بہ کمال خوشی اجازت دے دی۔'' (14)

آگرہ کے حکام کا بہ کمال خوشی اجازت دے دینا اور وہ بھی 13 جون 1857 کے پریس ایکٹ کے بعد یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ دستنبو کس نقطۂ نظر سے لکھی گئی تھی۔ کبیر احمد جائسی نے غالب کے خط بنام حکیم غلام نجف خاں مکتوبہ 9 جنوری 1857 سے ایک اقتباس نقل کیا اور لکھا کہ:

> ''جب نجف کے خط میں غالب کا یہ عالم ہے کہ لکھنا تو بہت چاہتے ہیں مگر حالات اور وقت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر لکھ نہیں سکتے تو پھر اس کتاب میں سب حالات صاف صاف اور راست انداز میں کیسے بیان کر سکیں گے...... غالب نے یہ کتاب صرف اس لیے تصنیف کی ہے کہ باغیوں کی مذمت اور انگریز مقتولوں پر نوحہ خوانی کر کے وہ خود کو انگریزوں کے بہی خواہوں میں شمار کرالیں تا کہ ان کو وہ موروثی جائداد واپس مل سکے، جس کو وہ مدتوں پہلے رو پیٹ کر صبر کر چکے تھے اور اس کے علاوہ حکام اعلیٰ تک ان کی رسائی ہو جائے تا کہ وہ

بدلے ہوئے حالات میں بھی دلی میں ویسے ہی معزز رہیں جیسے مغلیہ عہد حکومت میں تھے۔ لیکن اگر اس کتاب میں وہ صرف انگریز مقتولوں کی نوحہ گری تک ہی خود کو محدود کر دیتے تو اس کا اثر رائے عامہ پر اچھا نہ پڑتا اور حکام کی دوستی کے باوجود اہل دہلی کی نظروں سے اتر جاتے اس لئے انھوں نے جستہ جستہ بربادئ دہلی کا بھی تذکرہ کر دیا ہے تاکہ وہ الزام سے بچ سکیں کہ یہ کتاب انگریزوں کو خوش کرنے کے لیے لکھی گئی ہے۔"(15)

1961 میں دستنو کے دو تراجم سامنے آئے ایک رسالہ تحریک (اپریل مئی 1961) میں شائع ہوا یہ ترجمہ مخمور سعیدی کا تھا اور دوسرا اردوئے معلیٰ (فروری 1961 میں) شایع ہوا جو رشید حسن خاں نے کیا۔ غالب نے یہ کتاب چونکہ ایک خاص مقصد کے تحت لکھی تھی اس لیے اس میں باغیوں کو تو درندہ ثابت کرنے کی کوشش کی اور انگریزوں کی درندگی پر پردے بھی ڈالے اور ان کے مظالم کو کم کر کے پیش کیا۔ ان کے ردعمل کو فطری تک ٹھہرانے کی کوشش کی۔ غالب لکھتے ہیں کہ:

"انگریزوں کو دیکھو کہ جب دشمنی کا (بدلہ لینے) کے لیے لڑنے اٹھے اور گناہ گاروں کو سزا دینے کے لیے لشکر آراستہ کیا، چونکہ وہ شہر والوں سے بھی برہم تھے تو موقع تو اس کا تھا کہ شہر پر قابض ہونے کے بعد کتے بلی (تک کو) زندہ نہ چھوڑتے، (لیکن انھوں نے) ضبط کیا (اگرچہ) ان کے سینے میں غصے کی آگ بھڑک رہی تھی، عورتوں اور بچوں کو ذرا نہیں ستایا۔"(16)

سید معین الرحمٰن نے اس زمانے کے بعض غیر جانبدار انگریز مؤرخین کی تاریخوں سے ان اقتباسات کو نقل کیا ہے جن میں منظر نامہ بالکل برعکس ہے۔(17) ان کا یہ خیال بھی درست ہے کہ:

"غالب نے یہ سرگزشت متعارف اور مروجہ فارسی میں لکھنے کے بجائے فارسی قدیم میں لکھی اور فارسی بھی وہ فارسی قدیم کہ جس کا ہندوستان کا تو کیا مذکور، پارس کے بلاد میں بھی نشان نہیں رہا تھا، تاکہ کتاب کے مندرجات بیشتر اہل ہند کے لیے سربستہ راز رہیں۔"(18)

چنانچہ دستنبو کے مندرجات کو 1857 کی بغاوت کے مطالعے کے سلسلے میں بہت قابل اعتبار نہیں کہہ سکتے بلکہ ان پر بہت احتیاط کے ساتھ اعتبار کرنا چاہیئے۔ غالب کے خطوط میں اس قیامت صغریٰ کے نقوش زیادہ واضح ہیں اور زیادہ معتبر بھی۔ خصوصاً دہلی کی تباہی کا جیسا اندوہناک بیان

غالب کے خطوں میں ملتا ہے کہیں اور نہیں ملتا۔ مخمور سعیدی نے دستنبو کا جو ترجمہ 1961 میں کیا تھا اس کو کتابی شکل میں NBT نے 2007 میں 1857 کی کہانی مرزا غالب کی زبانی کے نام سے شائع کردیا ہے۔ اس کے پیش لفظ میں مخمور سعیدی لکھتے ہیں:۔

> 1857 کے واقعات نے مرزا غالب کے دل و دماغ پر کتنا گہرا اثر ڈالا تھا...اس کا زیادہ واضح اظہار ان کے خطوں میں ہوا ہے۔ یہ خط جب وہ اپنے دوستوں یا شاگردوں یا قدر شناسوں کو لکھ رہے تھے اس وقت یہ بات ان کے ذہن میں نہیں تھی کہ انھیں شائع بھی ہونا ہے۔ اس لیے ان میں انھوں نے زیادہ کھل کر شہر اور اہل شہر پر ٹوٹنے والی مصیبتوں کا بیان کیا ہے اور اپنا رد عمل بھی زیادہ واشگاف لفظوں میں ظاہر کیا ہے۔'' (19)

انگریزوں کے تانڈو کا سب سے زیادہ شکار دلی ہوئی۔ اس دلی کی ہر کروٹ مرزا کے خطوں میں اس طرح محفوظ ہوگئی ہے کہ ہم غالب کے خطوں میں دہلی کی پسپائی کی متحرک تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ دہلی کی تباہی کا اندوہناک بیان صرف غالب کے خطوں میں ملتا ہے۔ 1857 کی بغاوت نے پوری بساط ہی الٹ دی تھی اور سارے مہرے بکھر گئے خواہ ان کا بادشاہ سے تعلق ہو یا نہ ہو۔ کوئی قلبی وابستگی رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں۔ غالب بھی انھیں میں سے ایک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پروفیسر خلیق احمد نظامی جب 1857ء کے بعد کے غالب کو پہلے کے غالب سے یکسر مختلف بتاتے ہیں تو ہمیں تسلیم کر لینے میں قطعی تامل نہیں ہوتا۔ یہ ایک بڑا تہذیبی مقاطعہ تھا دلی تاراج تو پہلے بھی ہوئی تھی لیکن وہ تہذیبی تسلسل ٹوٹا نہیں تھا، جو مغلوں کی ہندوستان میں آمد سے شروع ہوا اور اپنی وسیع المشربی سے گزشتگاں کی تہذیبی روایات کو جذب کرتا اور ان میں نئے رنگوں کا اضافہ کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ دلی کے یہ تمام رنگ مرزا کی تحریروں میں محفوظ ہیں خصوصاً ان مکتوبات میں جن کو لکھنے کا مشغلہ مرزا نے بقول ڈاکٹر خلیق انجم ''پہاڑ سا دن کاٹنے'' کے لیے اختیار کیا تھا۔ مرزا نے ہرگوپال تفتہ کو ایک خط میں لکھا بھی ہے کہ ''انصاف کرو'' کتنا کثیر الاحباب آدمی تھا کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس دو چار دوست نہ ہوتے ہوں اب یاروں میں ایک شیو جی رام برہمن اور بال مکند اس کا بیٹا، یہ دو شخص ہیں کہ گاہ گاہ آتے ہیں۔ اس سے گزر کر لکھنو اور کالپی اور فرخ آباد اور کس

کس ضلع سے خطوط آتے رہتے تھے۔ان دوستوں کا حال ہی معلوم نہیں کہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں؟ وہ آمد خطوط کی موقوف۔صرف صاحبوں کے خط آنے کی توقع۔اس میں وہ دونوں صاحب گاہ گاہ، ہاں ایک تم کہ ہر مہینے میں ایک دوبار مہربانی کرتے ہو۔''19 (جون،1858)۔

اور شاید اسی لیے غالب کے خطوط میں ان کی ذات اور وہ کائنات جس کا وہ حصہ تھے اس طرح نمایاں ہوگئی ہے کہ ہر شخص اس میں ان دونوں کے اسرار پالیتا ہے اور اسی لیے مرزا کے خطوط نے ان کی شہرت ومقبولیت میں مسلسل اضافہ کیا ہے جس کا اعتراف حالی نے بھی کیا ہے انھوں نے لکھا کہ'' جہاں تک دیکھا جاتا ہے مرزا کی عام شہرت ہندوستان میں جس قدر ان کی اردو نثر کی اشاعت سے ہوئی ویسی نظم اردو سے نہیں ہوئی۔'' اور مرزا میں عوام کی دلچسپی کا بڑا سبب یہ ہے کہ ان خطوط میں مرزا کی ذات اور کائنات کا بے تکلف اظہار ہوا ہے خصوصاً دلی کی ویرانی کی جیسی متحرک اور جاندار تصویریں ان خطوں میں ملتی ہیں کہیں اور نہیں مل سکتیں اور اسی لیے ہمیں مولانا غلام رسول مہر کی اس رائے سے مکمل اتفاق ہے کہ'' اسی طرح دہلی اور بعض دوسرے مقامات کے حالات ان خطوں میں کثرت سے موجود ہیں....انھوں نے غدر کے نتائج وعواقب پر بیسیوں خطوں میں بحث کی ہے اور جو نقشہ پیش کیا ہے وہ کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتا''۔(20) ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں دلی کی ویرانی اور اپنی تنہائی وافسردگی کی کیسی تصویر کھینچی ہے لکھتے ہیں۔۔''کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں جو دکھ مجھ کو ہے اس کا بیان تو معلوم، مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں: انگریز کی قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے اس میں کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد، ہندوستانیوں میں کچھ عزیز دوست کچھ شاگرد کچھ معشوق؛ سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو زیست کیوں نہ دشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے کہ جواب میں کروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔انا للہ و انا الیہ راجعون؛'(21)۔

اس خط کے لفظ لفظ سے جو دردمندی اور بے کسی ٹپکتی ہے وہ کسی تبصرے کی محتاج نہیں وہ غالب

جس کا دعویٰ تھا کہ اگر شاعری دین ہوتی تو اس کا دیوان کتاب الٰہی ہوتا، اس کی الہامی کتاب ہوتا اور جس پر عبدالرحمٰن بجنوری نے مہر تصدیق بھی ثبت کردی، وہ کتنی مجبوری وہ بے کسی کے عالم میں اپنا آپ تماشائی ہے مرزا قربان علی بیگ خاں سالک کو لکھتا ہے۔''یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں مخلوق کا کیا ذکر؟ کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں، رنج وذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔''(غالب کے خطوط جلد دوم)

یہ بیگانگی وابستگی وشکست ذات کی انتہائی منزل پر پہنچ کر جنم لیتی ہے۔ یہ اپنے کو اپنا غیر تصور کرنا ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں اس کے لیے بڑا دل گردہ چاہیے اور یہی ٹھہرا ہے اب فن ہمارا۔ غالب کو یہ غم کھائے جاتا تھا کہ''اس فتنہ وآشوب میں تو شاید کوئی میرا جاننے والا نہ بچا''اور اس پر ذاتی ناکامیوں اور المناکیوں نے تیزابی اثر ڈال دیا تھا۔ ان کی پریشانی یہ نہ تھی کہ مغلوں کا شیرازہ بکھر رہا تھا اور یہ آفتاب غروب ہونے کو تھا بلکہ یہ تھی کہ مغلوں کی جگہ لینے والا بھی کوئی نہ تھا اور انگریزی حکومت غالب کی قدردان نہ ہوسکتی تھی اس لیے کہ اس کے فنی وتہذیبی اقدار جداگانہ تھے اگرچہ غالب نے ان سے بھی دادسخنوری پانے کی کوشش کی اور کچھ حد تک کامیاب بھی ہوئے تاہم وہ اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے کہ ان کا نظام اقدار یکسر مختلف ہے کیا فنی، کیا تہذیبی اور کیا معاشرتی۔ اور اس میں ان کے لیے وہ گنجائش نہیں نکل سکتی جس کے وہ خواہاں تھے اس میں وہ اپنے ترک نژاد ہونے کی دھونس جما سکتے تھے اور نہ اپنے کسی حریف پر سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری کی پھبتی کس سکتے تھے۔ گویا وہ بنیادی طور پر اپنی شناخت کے، اپنے تشخص کے مسئلے سے دوچار تھے۔ ان کی کوئی جذباتی وابستگی مغلیہ سلطنت سے نہ تھی۔ انھوں نے جو مرزا حاتم علی بیگ کو لکھا کہ''ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی ہے کہ.....کھاؤ پیو مزے اڑاؤ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے''اس کو محض سخن آرائی یا تمسخر نہیں سمجھنا چاہیے یہ حرف بہ حرف صحیح ہے جس کا سب سے بڑا ثبوت بہادر شاہ ظفر کے انتقال پر غالب کا وہ بیان ہے جو میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں ملتا ہے۔ وہ میر مہدی مجروح کو

اس بہادر شاہ ظفر کے انتقال کی خبر جوان کا مربی ومحسن تھا، اس لہجے میں دیتے ہیں جو ہر طرح کے جذبے سے عاری ہے۔ وہ بہادر شاہ جو غالب کے کئی عدد قصیدوں کا سزاوار رہا، جس نے غالب کی رہائی کے لیے سفارشی خط لکھا تھا، اس کے انتقال کی خبر غالب یوں دیتے ہیں...'' 17 نومبر، 14 جمادی الاول سال حال جمعہ کے دن ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ و قید جسم سے رہا ہوئے، انا للہ وانا الیہ راجعون'' (16 دسمبر 1862)

غالب بنیادی طور پر اپنی تباہی کے نوحہ خواں ہیں یہ الگ بات ہے کہ اس کے سرے کہیں دلی کی تباہی سے تو کہیں ہمارے تہذیبی اقدار کی پسپائی اور شکست سے جا ملتے ہیں اور اس حد تک کہ ڈاکٹر خلیق انجم نے لکھا ہے کہ'' 1857ء کے انقلاب کی تصویر ہمارے ذہنوں میں وہ ہے جو غالب نے پیش کی ہے۔'' 1850ء کے بعد غالب کی مشہور غزل میں یہ شعر ملتا ہے ۔

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

پروفیسر مسعود حسین خاں نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ'' غالب کی واردات دلی کی بھی واردات ہے رنگا رنگ بزم آرائیاں اب دونوں کے لیے یاد رفتہ بن چکی ہیں۔'' (22) اس سے دکھانا مقصود یہ ہے کہ دلی اور غالب پر ایک سا وقت پڑا تھا اور غالب کو اس کا شدید احساس تھا جو موقع بموقع اظہار کے سانچے میں ڈھلتا رہتا تھا۔ شیخ محمد اکرام نے آثار غالب میں یہ تاثر دیا کہ مغل نفاست پسندی خوش معاشی عیش کوشی اور ہموار طبعی کے قائل ہوتے ہیں اور غالب ان اقدار کے بہترین ترجمان تھے۔ اس بنیاد کو مستحکم کیا خواجہ احمد فاروقی نے۔ انھوں نے لکھا'' قدیم ترکوں میں ایک قسم کی دینا داری، عقل معاش، عیش پسندی اور پرکاری بھی ملتی ہے۔۔ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے.... غالب مغل تھے..... ان کی رگوں میں وہی خون موجزن تھا جو مغل بادشاہوں کی رگوں میں تھا ان ہی لوگوں کی طرح ان کو زندگی کی اچھی چیزوں سے محبت تھی اچھا کھانا، اچھا پینا، اچھا رہن سہن۔'' (23) اور اسی طرح محبت محرومی اور حسرت کی داستان غالب کی زندگی اور شاعری ہے اسی نے نظم ونثر کا وہ نگار خانہ سجایا ہے جو ہماری تہذیب کا گرانقدر حصہ ہے، ہمارا عظیم تہذیبی ورثہ ہے اور ہمارے پورے تہذیبی سفر کی داستان

سناتا ہے۔ جس کے تمام تر سروکار اگر چہ مادی ہیں جس کو ہم پروفیسر نثار احمد فاروقی کے لفظوں میں چاہیں تو ''تاریخ کے دوراہے پر کھڑے.... (ایک فنکار کا)....تاریخی شعور..... یا اسے تاریخی وجدان'' کہہ لیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ ان تاروں کو رونے میں یقین نہیں رکھتے تھے پل بھر جو چمک کر ٹوٹ گیے۔ خواہ ان میں کوئی تارا سلطنت تیموریہ کے نام سے ہی کیوں نہ جانا جاتا ہو۔ ڈاکٹر پرسیول اسپیر نے اپنے مقالے میں، جس کا ترجمہ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کیا تھا، لکھا ہے ''غالب کی یہ خواہش تھی کہ وہ بہادر شاہ ظفر کے درباری شاعر اور ملک الشعرا کا رتبہ حاصل کریں.. بدقسمتی سے غالب نے پہلے اپنی عرضداشتیں مرزا سلیم کے آگے گزرانی تھیں جنھیں جانشینی کے لیے اکبر شاہ ثانی کی حمایت حاصل تھی اور اس طرح وہ بہادر شاہ کے حریف تھے۔ غالب کو یہ داغ دھونے میں تیرہ سال لگے اور پندرہ قصیدے لکھنے پڑے تب جا کر انھیں 1850ء میں نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کے خطابات، خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے کا منصب اور پچاس روپے ماہوار کی تنخواہ میسر آئی اس کے بعد بہادر شاہ کے ولیعہد مرزا فخر الدین جیسا سرپرست انھیں مل گیا جن کی وجہ سے چار سو روپے سالانہ تنخواہ مقرر ہوئی.... مگر یہ کامرانیاں بڑی کم مہلت تھیں کیونکہ 1856 میں مرزا فخر الدین کا انتقال ہو گیا اور اسی کے ایک سال کے بعد غدر ہوا۔'' تو غالب کی غدر سے برگشتگی کی ایک وجہ یہ بھی تھی جو سراسر ذاتی تھی پھر دہلی کی تباہی بھی۔ اس لیے کہ دہلی سیاسی سطح پر لاکھ بے اثر سہی تھی تو دلی، ایک طلسماتی فضا رکھتی تھی جو کچھ تو سلاطین تیموریہ کی خود فریبی نے پیدا کی تھی کچھ ادبی وتہذیبی سرگرمیوں کی دین تھی اور بادشاہ شطرنج کا ہی کیوں نہ ہو اس کے گرد جو مہرے رقص کرتے ہیں اس سے انجمن آباد تو بہر حال رہتی ہے۔ ڈاکٹر پرسیول اسپیر نے بھی لکھا ہے کہ'' دہلی ایک بہت خوش حال شہر تھا کیونکہ یہ ایک تجارتی مرکز تھا جہاں سے جنوب اور مشرق کی طرف سامان پہنچایا جاتا تھا 1852 میں اس کی آبادی ایک لاکھ ساٹھ ہزار تھی اس آبادی میں تاجر، مہاجن عالم فاضل لوگ اور مغل دربار کے حلقہ بگوش لوگ شامل تھے.:. غدر سے پہلے مغلوں کی زرق برق زندگی پر نظر ڈالیے تو ایک خواب کا سا عالم تھا اور یقین نہیں آتا تھا کہ دنیا میں ان چیزوں کا وجود بھی ہو سکتا ہے یہ اس گروہ کا سارا پیدا کیا ہوا تھا جو یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ جیسے ان کا

ماضی ابھی تک باقی ہے... جب تک یہ جادو قائم رہا یہ لوگوں کی تفریح اور ذہنی تعیش کا سبب بنا رہا ہے.....شاہی دربار میں کچھ بھی خرابیاں ہوں مگر اس کی حیثیت محض نمائش کی نہیں تھی اس کا اثر بہت صحتمندانہ اور سہ طرفہ تھا یہ آداب تہذیب کا سرچشمہ تھا جس میں خود بہادر شاہ ظفر بہت دلچسپی رکھتا تھا...دہلی جب اپنی مرکز اقتدار کی حیثیت کھو چکی تھی اس کے کافی عرصے بعد تک اس کی تہذیب کے منبع کی حیثیت باقی رہی دوسرے اس نے فنون کی سرپرستی کی شاہانہ روایت کو باقی رکھا.....اس زمانے میں جس طرف سب سے زیادہ توجہ کی گئی وہ تھی اردو اور فارسی شاعری۔ یہ دہلی کے لوگوں کا سب سے اہم ذہنی مشغلہ تھا مشاعرے جن کی صدارت اکثر بادشاہ خود کیا کرتا تھا شہر کی سماجی زندگی کے اہم ترین مواقع ہوا کرتے تھے...سیاسی معرکہ آرائیوں کی جگہ شاعرانہ معرکہ آرائیوں ۔ ۔ لے لی تھی۔"(24)

یہ موہنی اور خوابناک فضا اس دلی کی تھی جو انحطاطی دور سے گزر رہی تھی۔ بہادر شاہ ظفر کے بارے میں کہا جاتا ہے وہ ایک طرف انگریزوں کے قیدی تھے تو دوسری طرف شاہان تیموریہ کی شاندار روایات کے، اور یہ دوسری قید زیادہ سخت اور جان لیوا تھی اور اسی سے دلی کی رونق بھی قائم تھی اور 1857 کی بغاوت نے یہ پورا منظر نامہ بدل دیا۔ اگرچہ پہلے بھی جو کچھ تھا وہ بہت حوصلہ افزانہ تھا بلکہ روبہ زوال ہی تھا اور افق پر غروب آفتاب کی سرخی پھیل چکی تھی اور غالب جیسا سیاسی شعور رکھنے والا شخص اس حقیقت سے بے خبر رہا ہوگا ایسا نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم اندھیرے کی حکمرانی قائم نہ ہوئی تھی اور بغاوت اور اس کے ردعمل نے جس طرح یہ بساط پل میں الٹ دی وہ قطعی ناقابل برداشت صورتحال تھی اور "دہلی کے شہریوں کے لیے بڑا سخت وقت تھا۔" میرے خیال میں کیا ہونے والا ہے اس کا احساس غالب کو بہت پہلے سے تھا 1803ء کے بعد سے ہی بادشاہ کی حیثیت محض ایک ملازم کی رہ گئی تھی تو کل کی تصویر کیا ہوگی اس سے اہل نظر واقف ضرور تھے لیکن اس طرح سے ہوگا یہ قطعی غیر متوقع تھا۔ مرزا کے کلام میں بھی اس احساس کی جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں غالب کو اس تہذیبی آویزش کا اور سلطنت تیموریہ کے مستقبل کا اندازہ بہت پہلے سے تھا جس کو مسلسل تقویت پہنچائی گرد وپیش کی بے ثباتی، ماحول کے جبر اور ذاتی زندگی کی المناکیوں نے بلکہ میں تو غالب کی شوخی کو بھی ردعمل خیال کرتا ہوں حالات کے جبر اور ذاتی ناکامیوں کا۔ اور کچھ مرزا کی محزونی طبع بھی جوان سب کے

نتیجے میں ان کی سرشت کا حصہ بن چکی تھی اس احساس کو شدید کر دیتی ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے — متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر 1816ء

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ 1816ء

شکلِ طاؤس گرفتار بنایا ہے مجھے — ہوں وہ گلدام کہ سبزے میں چھپایا ہے مجھے 1816ء

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے — میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے 1826ء

خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش — شراب خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں 1826ء

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ — سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں 1826ء

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے — اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے 1826ء

گھر میں کیا تھا جو ترا غم اسے غارت کرتا — وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے 1833ء

غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر — کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے 1833ء

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا — بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا 1847ء

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں 1852ء

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر — کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے 1853ء

ہے غنیمت کہ بہ امید گزر جائے گی عمر — نہ ملے داد، مگر روزِ جزا ہے تو سہی

نقل کرتا ہوں اسے نامۂ اعمال میں، میں — کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی 1857ء

ان اشعار میں وہ کشمکش کتنی واضح ہے جو اس عہد کے باشعور فرد کا مقدر تھی ان میں آنے والے کل کی آہٹ صاف سنی جاسکتی ہے۔ یہاں ذات غیر ذات میں تحلیل ہو گئی ہے اور ذات کا مرثیہ کائنات کا مرثیہ بن گیا ہے اور سلطنت تیموریہ کے ڈھلتے آفتاب کی جھلک صاف دیکھی جاسکتی ہے زیادہ سے زیادہ ہم اسے غیر شعوری کہہ سکتے ہیں حالانکہ حالات کے تیور اور غالب کی سوجھ بوجھ کے جو شواہد موجود ہیں وہ کچھ اور ہی کہتے ہیں۔ غالب زمانہ شناس بھی تھے اور زمانہ سازی کی

کوششیں بھی ان سے وابستہ دکھائی دیتی ہیں ہاں: ان کی کامیابی اور ناکامی کے مسئلے پر بحث کی جا سکتی ہے۔ان اوصاف کی موجودگی میں ان اشعار کو محض اتفاق کہہ کے ٹالنا مناسب نہیں۔ غالب کو اس قیامت سے گزرنا پڑا جس کا انھیں کچھ اندازہ تو تھا لیکن اس کی صورت غیر واضح تھی اور ان شدائد کا بھی اندازہ نہ تھا جن سے غدر/بغاوت نے دلی اور دلی کے افراد کو دوچار کیا جن میں غالب بھی شامل تھے اور ان کی شخصیت بھی پارہ پارہ ہوئی۔ یوسف مرزا کو لکھتے ہیں۔''آدمی کثرت غم سے سودائی ہو جاتا ہے عقل جاتی رہتی ہے اگر اس ہجوم غم میں میری قوت متفکرہ میں فرق آ گیا ہو تو کیا عجب ہے بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔'' اور اس ہجوم غم کی تفصیلات بھی غالب کی زبانی سنیے۔۔۔''پوچھو کہ کیا غم ہے؟ غم مرگ، غم فراق، غم رزق، غم عزت، غم مرگ میں قلعہ نامبارک سے قطع نظر کر کے اہل شہر کو گنتا ہوں۔ مظفر الدولہ، میر ناصر الدین، مرزا عاشور بیگ میرا بھانجا، اس کا بیٹا احمد مرزا انیس برس کا بچہ، مصطفیٰ خاں ابن اعظم الدولہ، اس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں اور مرتضیٰ خاں، قاضی فیض اللہ کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا؟ اے لو بھول گیا حکیم رضی الدین خاں، میر احمد حسین میکش اللہ اللہ ان کو کہاں سے لاؤں؟ غم فراق حسین مرزا، یوسف مرزا، میر مہدی میر سرفراز حسین، میرن صاحب خدا ان کو جیتا رکھے۔ کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے وہاں خوش ہوتے۔ گھر ان کے بے چراغ، وہ خود آوارہ، سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں، کلیجا ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے مگر میں علی کو گواہ کرتے کہتا ہوں کہ ان اموات کا غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے۔'' (28 نومبر 1859)۔ غالب کے خطوط جلد دوم

اور احباب پر ہی کیا موقوف۔ میرزا کا دیوانہ بھائی بھی اس ہنگامے کی نذر ہوا اور وہ بھی گوروں کی گولی سے جاں بحق ہوا۔ اگر چہ مرزا نے مصلحتاً اس کا ذکر نہیں کیا اور لکھا کہ ''حقیقی میرا ایک بھائی دیوانہ مر گیا'' پھر مرزا کی معاشی بدحالی اور پسپائی کے شدید احساس نے ان کی افسردگی میں اور اضافہ کر دیا تھا، شاید احساس زیاں نے انھیں گھیرا تھا جس نے کہیں کہیں تو عجیب حسرت ناک شکل اختیار کر لی ہے اور کہیں طنز و استہزا کی شکل میں نمودار ہوتا ہے عبدالغفور سرور کو اپنی آپ بیتی اس طرح لکھی

ہے کہ ایک ایک لفظ نوحہ معلوم ہوتا ہے۔''بعد ایک زمانے کے بادشاہ دہلی نے پچاس روپے مہینہ مقرر کیا، ان کے ولی عہد نے چار سو روپے سال۔ ولی عہد اس تقرر کے دو برس کے بعد مر گئے۔ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بہ صلۂ مدح گستری پانچ سو روپے مقرر ہوئے۔ وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جئے۔ یعنی اگر چہ اب تک جیتے ہیں، مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی ولی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی۔ سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی؛ ایسے طالع مربی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں؟ اب جو میں والیٔ دکن کی طرف رجوع کروں، یاد رہے کہ متوسط یا مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی ضائع ہو جائے گی اور والی شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا اور احیاناً اگر اس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی۔'' (نومبر 1860)، غالب کے خطوط جلد دوم ص 610-609

یہ یاسیت، بے حوصلگی یہ افسردگی اور پسپائی کا یہ شدید احساس اس اسد اللہ خاں غالب کی تحریر سے جھلکتا ہے جو اس طرح کے اشعار کہہ چکا ہے۔

جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں (1833)

ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں (1852)

ایک خط میں لکھتے ہیں'' یہاں شہر ڈھیہ رہا ہے، بڑے بڑے نامی بازار، خاص بازار اور اردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا، اب پتا بھی نہیں کہ کہاں تھے؟'' ستمبر 1860 بنام چودھری عبدالغفور سرور یوسف مرزا کو لکھتے ہیں ۔'' آغا باقر کا امام باڑہ اس سے علاوہ کہ خداوند کا عزا خانہ ہے، ایک بنائے قدیم رفیع مشہور۔ اس کے انہدام کا غم کس کو نہ ہوگا؟ یہاں دو سڑکیں دوڑتی پھرتی ہیں۔ ایک ٹھنڈی سڑک اور ایک آہنی سڑک۔ محل ان کا الگ الگ۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ گوروں کا بارک بھی شہر میں بنے گا اور قلعے کے آگے جہاں لال ڈگی ہے، ایک میدان نکالا جائے گا۔ محبوب کی دکانیں، بھیلیو کے گھر، فیل خانہ، بلاقی بیگم کے کوچے سے خاص بازار تک، یہ سب میدان ہو جائے گا۔ یوں سمجھو کہ اموجان کے دروازے سے قلعے کی

خندق تک سوائے لال ڈگی اور دو چار کنوؤں کے آثار عمارت باقی نہ رہیں گے۔ آج جاں نثار خاں کے چھتے کے مکان ڈھنے شروع ہو گئے ہیں۔ کیوں میں دلی کی ویرانی سے خوش نہ ہوں؟ جب اہل شہر ہی نہ رہے، شہر کو لے کے کیا چولھے میں ڈالوں؟'' (28 جولائی، 1859ء) ص 72-771 جلد دوم غالب کے خطوط۔

اور میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں۔ ''مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرالق ودق ہے۔ انیٹوں کے جو ڈھیر پڑے ہیں، وہ اگر اٹھ جائیں تو ہو کا مکان ہو جائے۔ یاد کرو، مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کوئی بانس نشیب تھا۔ اب وہ باغیچے کے صحن کے برابر ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ فصیل کے کنگوڑے کھلے رہے ہیں باقی سب اٹ گیا۔ کشمیری دروازے کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہو گیا۔۔۔۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا تھا۔ اب جو کنویں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا۔ تو صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ اللہ دلی نہ رہی اور دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حسن اعتقاد، ارے بندۂ خدا، اردو بازار نہ رہا، اردو کہاں، دلی کہاں، واللہ، اب شہر نہیں ہے، کمپ ہے، چھاؤنی ہے نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار، نہ نہر۔'' (1860)، ص 524 غالب کے خطوط جلد دوم۔

ایک اور خط میں مجروح کو ہی لکھتے ہیں۔۔ ''او میاں سید زادۂ آزادہ، دلی کے عاشق دلدادہ، ڈہے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے۔ حسد سے لکھنو کو برا کہنے والے، نہ دل میں مہر و آزرم، نہ آنکھ میں حیا و شرم، نظام الدین ممنون کہاں، ذوق کہاں، مومن کہاں؟ ایک آزردہ سو خاموش، دوسرا غالب وہ بے خود و مدہوش، نہ سخن وری رہی نہ سخن دانی، کس برتے برتا پانی؟ ہائے دلی؟ وائے دلی، بھاڑ میں جائے دلی۔'' (محرزہ 23 مئی، 1861)، ص 525 ایضاً۔

کیسا سپاٹ لیکن کتنا زہرناک بیان ہے کتنی نشتریت ہے ایک ایک لفظ میں۔ ایسا ہی ایک اور مختصر سپاٹ لیکن زہرناکی کی حدود میں داخل بیان ملاحظہ فرمائیں جو دلی کی عمارتوں سے تعلق رکھتا ہے۔۔ ''شہر کا حال میں کیا جانوں کیا ہے؟۔۔۔۔ جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا۔ دکانیں حویلیاں ڈھائی جائیں گی۔ ''دار البقا'' فنا ہو جائے گی۔ رہے نام اللہ کا۔ خان چند کا

کوچہ شاہ بولا کے بڑ تک ڈہے گا۔ دونوں طرف پھاوڑہ چل رہا ہے۔ باقی خیرو عافیت ہے۔''8 نومبر 1859 ص۔513 جلد دوم غالب کے خطوط۔

یہ آخری ٹکڑا خیر و عافیت کی کیسی زبردست نفی کرتا ہے گویا کثرت غم سے غم اور خوشی کا مفہوم ہی بدل گیا ہو۔ ایک خط میں عزیز الدین کو دلی کی ویرانی کا حال یوں لکھا ہے۔۔۔''دلی کو ویسا ہی آباد جانتے ہو جیسے آگے تھی؟ قاسم جان کی گلی میر خیراتی کے پھاٹک سے فتح اللہ بیگ خاں کے پھاٹک تک بے چراغ ہے۔ ہاں اگر آبادی ہے تو یہ ہے کہ غلام حسین خاں کی حویلی ہسپتال ہے اور ضیاء الدین خاں کے کمرے میں ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں اور کالے صاحب کے مکانوں میں ایک اور صاحب عالیشان انگلستان تشریف رکھتے ہیں....لال کنویں کے محلے میں خاک اڑتی ہے آدمی کا نام نہیں..... لکھمی کی دکان میں کتے لوٹتے ہیں'' ص۔1444 جلد چہارم، ایضاً۔

اور ہر گوپال تفتہ کے نام یہ خط ایک مکمل تصویر ہے اس قیامت کی جو بنام غدر ٹوٹی اور اس شخص کی جس پر ٹوٹی۔۔''صاحب! تم جانتے ہو یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے دیوان جمع کیے....ناگاہ، نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگر چہ صورت اس جنم کی بعینہ مثل پہلے جنم کے ہے۔ یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا اس کا جواب مجھ کو آیا اور ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہر گوپال و متخلص بہ تفتہ ہو، آج آیا اور میں جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دلی ہے اور اس محلے کا نام بلی ماروں کا محلہ ہے، لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈ نے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا، کیا امیر، کیا غریب، کیا اہل حرفہ۔ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ آباد ہو گئے ہیں....مبالغہ نہ جاننا، امیر، غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے تھے، وہ نکالے گئے۔ جاگیردار، پنسن دار، دولت مند، اہل حرفہ، کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمان قلعہ پر شدت ہے اور باز پرس اور دارو گیر میں مبتلا ہیں....میں غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں؛ خواہی اس کو نوکری سمجھو، خواہی مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی

مصلحت میں، میں نے دل نہیں دیا۔صرف اشعار کی خدمت بجالاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر، شہر سے نکل نہیں گیا۔میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے؛ مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات پائی نہیں گئی لہٰذا طلبی نہیں ہوئی....غرض کہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔سوار ہونا اور کہیں جانا تو بڑی بات ہے۔رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے؛ شہر میں ہے کون جو آے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں'' ص268، 5دسمبر 1857ء

یہاں پر اگر غالب اور تفتہ کے الگ الگ مذہب کو بھی ذہن میں رکھیں اور غدر سے پہلے ان میں جو یگانگت تھی اور غدر کے بعد جو خلیج حائل ہوتی گئی تو اس کی رمزیت دوبالا ہوجاتی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ گوروں نے جو امتیازی سلوک ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان روا رکھا اس سے غالب کو کچھ اندازہ ہوگیا تھا کہ اب ان میں وہ ہم آہنگی اور خلوص کی فضا باقی نہ رہے گی۔اس خط کے کئی جملے اس کا احساس دلاتے ہیں۔مثلاً ''ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و متخلص بہ تفتہ ہو، آج آیا'' اور کئی دوسرے جملے۔لیکن فی الحال میں اس بحث سے گریز کررہا ہوں۔مرزا اعلاء الدین خاں کو لکھتے ہیں ''اے میری جان، یہ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم پیدا ہوئے ہو۔وہ دلی نہیں ہے جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے وہ دلی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے....وہ دلی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ایک کنپ ہے مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ باقی سراسر ہنود۔معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپیہ مہینہ پاتے ہیں۔اناث میں سے جو پیرزن ہیں وہ کٹنیاں ہیں اور جوانیں کسبیاں'' (16فروری، 1862، ص384، جلد اول، غالب کے خطوط) اور شاہی خاندان پر جو بپتا پڑی وہ غالب کے حافظے میں ایک عبرتناک مرقعے کی طرح نقش ہوگئی تھی۔اسی لیے جب تفتہ کی سنبلستان چھپی اور غالب کو اس کی چھپائی پسند نہ آئی تو لکھتے ہیں ''اپنے اشعار کی اور اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ تم یہاں ہوتے اور بیگمات قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے؛ صورت ماہ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے، پائچے لیر لیر، جوتی ٹوٹی۔یہ مبالغہ نہیں بلکہ بے تکلف سنبلستان ایک معشوق خوبرو ہے، بدلباس ہے'' (اپریل 1861)، ص۔326 غالب کے خطوط۔

ان خطوط میں جس طرح دلی کے اجڑنے کی داستان ملتی ہے اور جس طرح غالب اسے الگ الگ بہانوں سے چھیڑتے ہیں خواہ موقع ومحل متقاضی نہ ہو۔ اس کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر خلیق انجم کی اس رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ یہ کدال اور پھاوڑے دلی کی عمارات پر نہیں غالب کے دل پر چل رہے تھے شاید اس لئے کہ یہ انہدام ان کے شکست آرزو کے احساس کو شدید کرتا تھا۔ غالب کے ان خطوں پر دلی کے نقوش اس لیے بھی ابھر آئے ہیں کہ وہ مجلسی مزاج رکھتے تھے اور جب مجلس اجڑ گئی اور انھیں شدید تنہائیوں نے گھیرا تو انھوں نے اس خلوت کو انجمن بنا لینا چاہا اور یہ انجمن دیر تک بجی رہے اس کے لیے دلی کے ذکر سے بہتر اور کیا ہوسکتا تھا۔ میر سرفراز حسین کو لکھتے ہیں۔" تمہارے دستخطی خط نے میرے ساتھ وہ کیا جو بوئے پیراہن نے یعقوب کے ساتھ کیا تھا.... وہی بالا خانہ ہے اور وہی میں ہوں سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے وہ میر سرفراز حسین آئے وہ یوسف مرزا آئے وہ میرن آئے وہ یوسف علی خاں آئے۔ مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا بچھڑے ہوؤں میں سے کچھ گنے ہیں۔ اللہ اللہ ہزاروں کا میں ماتم دار ہوں میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا، سنو غالب رونا پیٹنا کیا۔ کچھ اختلاط کی باتیں کرو' ص 762 ایضاً

یہی اختلاط کی باتیں ہیں جن میں غالب کی دلی محفوظ ہے اور اس پر قیامت ٹوٹی اس کا افسانہ بھی، وہ قیامت جس کی زد میں آنے والا حساس اور باشعور شخص جو شعوری یا غیر شعوری طور پر ابتدا سے ہی مغلیہ جاہ وجلال کا مرثیہ رقم کرتا رہا ہے ہمیں بتاتا ہے کہ ۔

گھر میں کیا تھا جو ترا غم اسے غارت کرتا　　وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے

اور حسرت تعمیر ہی اس کا ورثہ ہے جو وہ اپنے بعد والی نسلوں کو دے جاتا ہے اور اسی نے اسے ہماری زندگی کا اٹوٹ حصہ بنا دیا ہے۔

حواشی:

1۔ شمیم حنفی، غالب کا طرز احساس اور سماجی شعور کا مسئلہ: غالب کی تخلیقی حسیت، دہلی؛ غالب انسٹی ٹیوٹ، ص۔140

2۔ سجاد باقر رضوی۔ غالب فردوس گمشدہ سے گلشن نا آفریدہ تک۔ غالب نامہ جولائی 1982 دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ

3۔ سید ضمیر حسن دہلوی۔ عہد غالب میں لال قلعے کی معاشرتی زندگی۔ غالب نامہ جنوری 1985 دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ

4۔ ڈاکٹر خلیق انجم۔ غالب کے خطوط۔ جلد چہارم 1993 دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ, ص1490

5۔نثار احمد فاروقی۔غالب تاریخ کے دوراہے پر۔غالب نامہ، جولائی 1981 دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ
6۔پروفیسر خلیق احمد نظامی۔غالب کی دلی۔غالب نامہ جولائی 1982ء، دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ
7۔خواجہ الطاف حسین حالی۔یادگار غالب ص 1-2، 1982 لکھنؤ، اتر پردیش اردو اکیڈمی
8۔پروفیسر تنویر احمد علوی۔غالب کے فارسی قصائد۔غالب نامہ جولائی 1982 دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ
9۔سید احمد دہلوی۔رسوم دہلی مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم 1986۔دہلی: اردو اکادمی، ص 85
10۔خواجہ احمد فاروقی۔غالب کی دلی، یاد و بود غالب 1993۔دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
11۔خلیق احمد نظامی۔1857 کا تاریخی روزنامچہ، دہلی: الجمیعۃ پریس اکتوبر 1958 ص. 34
12۔ایضاً
13۔ایضاً ص ص 39.40
14۔بحوالہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، غالب اور انقلاب ستاون، دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ 2007، ص۔33
15۔کبیر احمد جائسی، دستنبو پر ایک نظر، علی گڑھ میگزین (غالب نمبر) 1969 ص ص۔181-82
16۔رشید حسن خان، ترجمہ دستنبو مشمولہ غالب اور انقلاب ستاون، دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ 2007 ص۔125
17۔ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، غالب اور انقلاب ستاون، دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ 2007، ص۔77
18۔ایضاً ص ص 65-66
19۔مخمور سعیدی، 1857 کی کہانی مرزا غالب کی زبانی، دہلی: نیشنل بک ٹرسٹ، 2007
20۔غلام رسول مہر۔خطوط غالب کی اہم خصوصیات۔احوال و نقد غالب مرتبہ پروفیسر محمد حیات خاں سیال۔1967۔لاہور، مکتبہ عالیہ[?] سنز
21۔ڈاکٹر خلیق انجم۔غالب کے خطوط جلد اول 1984ء دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ
22۔پروفیسر مسعود حسین خاں۔تجزیہ۔نقد و نظر ششماہی۔1979ء علی گڑھ
23۔خواجہ احمد فاروقی۔غالب کی شخصیت اور شاعری میں ترکی و ایرانی عناصر۔اردوئے معلیٰ غالب نمبر 1969ء دہلی یونیورسٹی: شعبہ اردو۔
24۔ڈاکٹر پرسیول اسپیر۔غالب کی دلی ترجمہ صدیق الرحمٰن قدوائی۔اردوئے معلیٰ فروری 1969ء دہلی: شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی۔

غالب اکیڈمی کی ادبی سرگرمیاں

ہمدرد وہ کام کررہا ہے جو حکومت کا ہے! رما کانت گوسوامی

ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن انڈیا کی جانب سے کمبلوں کی مفت تقسیم

غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں سخت ترین سردی کے موسم میں غریبوں کو کمبل تقسیم کرنے کے لیے ایک جلسے کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقع پر ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کے ڈاکٹر عزیز احمد صدیقی نے کہا کہ ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن ایک طرف بہت سے تعلیمی ادارے چلاتا ہے۔ دوسری طرف غریب طبقے کو پنشن اور طلبا کو وظائف بھی جاری کیے جاتے ہیں۔ سردی کے موسم میں غریبوں کے لیے کمبل بھی تقسیم کیے جاتے ہیں۔ اس موقع پر جناب رما کانت گوسوامی وزیر خوراک وصنعت حکومت دہلی نے اپنی تقریر میں کہا کہ میری یہ خوش قسمتی ہے کہ مجھے غریبوں کو کمبل تقسیم کرنے کے لئے بلایا گیا ہے۔ جو کام حکومت کا ہے وہ کام ہمدرد انجام دے رہا ہے یونیورسٹی چلانا، تعلیمی ادارے چلانا ،غریبوں کی مدد کرنا سب حکومت کا کام ہے اس کام میں ہمدرد نے بھی ذمے داری لی اس کے لیے ہمدرد قابل مبارکباد ہے۔ ہمدرد کا مطلب ہی ہمدردی ہے۔ ہمدرد غریبوں کا ہمدرد ہے انسانیت کے لیے یہ بہت بڑا کام ہے۔ جناب رما کانت گوسوامی نے اپنے دست مبارک سے غریبوں میں کمبل تقسیم کیے۔ اس موقع پر جناب متین امروہوی نے اپنا کلام پیش کیا۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے مہمانوں کا استقبال کیا۔

غزل سرائی کے پہلے مقابلے میں کیمبرج اسکول کی شارنیہ سنہا کو پہلا انعام،
غالب میں دلچسپی رکھنے والوں کی تعداد لامحدود ہو رہی ہے، پروفیسر شمیم حنفی
یوم وفات غالب پر غالب اکیڈمی میں پروگرام

15 فروری 2012 کو مرزا اسداللہ خان کے 143 ویں یوم وفات کے موقع پر غالب اکیڈمی اور آغا خان ٹرسٹ برائے کلچر کے اشتراک سے دہلی کے اسکولی طلباء و طالبات کے درمیان غالب اکیڈمی کے آڈیٹوریم میں غزل سرائی کا مقابلہ منعقد کیا گیا جس میں اندراپورم کے کیمرج اسکول کی طالبہ شارنیہ سنہا نے پہلا انعام حاصل کیا جبکہ دوسرا انعام نیو ہورائزن اسکول کی سمیہ ناز اور تیسرا انعام کیمبرج اسکول کی چترانشی اور خدیجۃ الکبریٰ اسکول کی عظمیٰ نے مشترکہ طور پر حاصل کیا۔ اسی طرح فتح پوری مسلم سینئر سیکنڈری اسکول کے دسویں جماعت کے طالب علم محمد محسن کو کونسیلیشن پرائز دیا گیا۔ علاوہ ازیں مقابلے میں حصہ لینے والے تمام طلبا و طالبات کو بھی ان کی حوصلہ افزائی کے لئے انعامات دیئے گئے۔ پہلی مرتبہ منعقدہ اس اپنی نوعیت کے منفرد مقابلوں میں دس سے زیادہ اسکولوں کے 30 سے زائد طلباء نے حصہ لیا۔ یہ انعامات غالب اکیڈمی کے صدر پروفیسر شمیم حنفی، شاعر زبیر رضوی، ایڈوکیٹ عبدالرحمان اور پروفیسر ابن کنول کے بدست تقسیم کیے گئے۔ اس موقع اپنی تقریر میں پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ اس طرح کے مقابلوں سے بچوں میں غالب کی شاعری میں دلچسپی مزید بڑھے گی۔ انہوں نے کہا کہ غالب کسی مسلک، کسی مکتب فکر یا سماج کے کسی ایک حلقہ کی جاگیر نہیں ہیں۔ یہ خوش آئند پہلو ہے کہ غالب کی شاعری میں دلچسپی رکھنے والوں کی تعداد لامحدود ہوتی جارہی ہے۔ بچوں کے ذوق وشوق کی تعریف کرتے ہوئے پروفیسر موصوف نے کہا کہ صحیح تلفظ کی ادائیگی کی طرف توجہ دینے کی خصوصی ضرورت ہے۔ چونکہ اردو ایک نازک زبان ہے، زیر زبر کے فرق سے معنی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے بچوں کو مشورہ دیا کہ غالب پر ہونے والے سیمینار میں بھی شرکت کریں جو 19 اور 20 فروری کو غالب

اکیڈمی میں ہو رہا ہے۔ ان مقابلوں کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اس میں متعدد طلبا اور طالبات ایسے تھے جن کی مادری زبان اردو نہیں تھی ۔ بیشتر طلباء نے ترنم میں غالب کا کلام پیش کیا۔ ان میں ساتویں جماعت کے ایک طالب علم محمد دانش نے بھی نہایت صحیح تلفظ کے ساتھ غالب کی ایک غزل پیش کی۔ پہلے انعام میں نقد مبلغ ایک ہزار روپے، ایک سرٹی فیکٹ اور دیگر تحائف، دوئم انعام مبلغ -/750 روپے نیز سرٹی فیکٹ اور تحائف اور انعام سوئم میں مبلغ -/500 روپے اور سرٹی فیکٹ و تحائف دیے گئے ایڈوکیٹ عبدالرحمان نے جنھوں نے بطور ایک جج کے فرائض بھی انجام دیئے کہا کہ اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے ان مقابلوں کا انعقاد کر کے ایک مستحسن قدم اٹھایا ہے۔ غالب کے حوالے سے اس طرح کے پروگرام کم ہی ہوتے ہیں اور یہ غالب کو خراج عقیدت پیش کرنے کا زیادہ بہتر طریقہ ہے۔ اس سے قبل ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ بچوں میں غالب کی شاعری کے تئیں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے اس مقابلہ کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا۔ انہوں نے کہا کہ آغا خان ٹرسٹ نے اسے کامیاب بنانے میں بڑی محنت کی۔ مقابلوں کے آغاز سے قبل غالب کی زمین میں متین امروہوی نے اپنا کلام پیش کیا۔

غزل سرائی مقابلوں سے قبل مزار غالب پر گل پوشی اور فاتحہ خوانی کی گئی جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی معزز شخصیات نے شرکت کی۔ اردو اکیڈمی کے سکریٹری انیس اعظمی، محمد احمد، نسیم احمد عباسی، احمد علی برقی، اسرار جامعی، فاروق ارگلی، پروفیسر ابن کنول، افروز علی قاسمی، اساتذہ اور دیگر حضرات شریک رہے۔ بعد ازاں مرزا غالب کی زندگی پر مشہور فلمساز گلزار کی فلم کی نمائش کی گئی۔ غالب کی زندگی اور خدمات پر ایک ڈرامہ بھی پیش کیا گیا۔ شام کو غزل سرائی کی ایک خوبصورت محفل سجائی گئی جس میں مشہور گلوکارہ گلشن آراء نے اپنی پرکشش آواز میں غالب کی چنندہ غزلیں سنا کر سامعین کو مسحور کر دیا۔
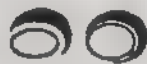
غالب اکیڈمی کے 43ویں یوم تاسیس اور مرزا غالب کے 143ویں یوم وفات کے موقع پر غالب اکیڈمی میں سہ روزہ پرگرام

پروگرام رپورٹ: 19رفروری 2012 سیمینار:

غالب اکیڈمی کے 43ویں یوم تاسیس اور مرزا غالب کے 143ویں یوم وفات کی مناسبت سے سہ روزہ پروگرام کے تحت 19رفروری 2012 کو غالب کے زمان ومکاں کے موضوع پر غالب اکیڈمی نئی دہلی میں ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا اس موقع پر پروفیسر شمیم حنفی نے اپنی تعارفی تقریر میں کہا کہ غالب کا زمان ومکاں کے بارے میں اپنا منفرد تصور تھا جس میں ماضی اور مستقبل دونوں ہیں، غالب نے کبھی اپنا گھر نہیں بنایا اور یہی مشورہ انہوں نے سر سید احمد خان کو بھی دیا تھا۔ پروفیسر حنفی نے غالب کے عہد کے حالات کا تفصیل سے جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ دیوان غالب ہم سب کا رفیق ہے اور ہر عہد میں سب کو لگتا ہے کہ اس سے زیادہ مشکل دور نہیں آیا ہوگا۔ انہوں نے مزید کہا کہ غالب کے زمان ومکاں کو دیکھا جائے تو انسانی افسردگی اور نشاط دونوں پائے جاتے ہیں۔ ناول، تنقید اور سوانح اسی دور میں لکھے گئے۔ اس دور میں کیسی کیسی شخصیات موجود تھیں۔ ان میں مولانا فضل الحق خیر آبادی، مفتی صدر الدین آزردہ، سر سید احمد خان، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ غالب کا پورا عہد آزمائشوں سے عبارت ہے اور اس کا اظہار اردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی ہوا ہے۔ پہلی جنگ آزادی کے پرآشوب حالات کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر حنفی نے کہا کہ 1857 کا واقعہ بہت بڑا انقلاب تھا، اس وقت دو الگ الگ دنیائیں تھیں، اور غالب دیوار سے بچتے تھے دہلی میں کبھی گھر نہیں بنایا ہر وقت نکلنے کی کوشش کرتے، کلکتہ کا سفر کیا۔ معاشرہ ایک نئے تغیر کے عمل سے گذر رہا تھا۔ اس موقع پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر قاضی افضال حسین نے اس اہم نکتہ کی طرف اشارہ کیا کہ معاشرہ میں یہ تبدیلی کا عمل فطری نہیں تھا بلکہ برطانوی استعمار کے اشارہ پر یہ سب کام ہو رہا تھا۔ معاشرہ تبدیل نہیں ہو رہا تھا بلکہ یہ حاکم وقت کی منشاء

کے مطابق تبدیل کیا جارہا تھا' اس سلسلہ میں مثالیں پیش کرتے ہوئے پروفیسر افضال نے کہا کہ بچوں کی نصابی کتب میں الف سے اللہ کی جگہ پر آم اور مغل بادشاہ اکبر کو پہلا سیکولر بادشاہ قرار دینا وغیرہ اس سے پہلے کبھی نہیں لکھا گیا تھا۔انہوں نے کہا کہ معاشرہ میں جو بھی تبدیلیاں لائی جارہی تھیں ان کا منشاء برطانوی اقتدار کو دوام بخشنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ محمد حسین آزاد نے جب بچوں کی ابتدائی کتابیں لکھیں تو اس پر لاہور میں زبردست احتجاج ہوا ہے اور محمد حسین آزاد نے خود اس کا اعتراف کیا ہے کہ وہ حکومت کی منشاء کے مطابق کام کررہے تھے۔خود اس وقت جو تعلیمی ادارے اور کالج کھولے گئے ان میں ریسرچ کی کوئی گنجائش نہیں تھی کیوں کہ ان کا مقصد برطانوی حکومت کے کارندے فراہم کرنا تھا نہ کہ محقق پیدا کرنا۔ یہ بات آج بھی انسٹی ٹیوٹ کے ریکارڈ پر موجود ہے۔انہوں نے کہا کہ اس زمانے کے حالات اور واقعات کا معروضی تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ حقیقی صورت حال کو منصۂ شہود پر لایا جاسکے کیونکہ وہ ایک خوف زدہ معاشرہ تھا جسے ان سب چیزوں کو قبول کرنے پر مجبور کیا جارہا تھا۔

اپنے مقالہ' غالب کے معاصر فارسی شعرا' میں پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کہا کہ ۱۹ ویں صدی میں اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری ہورہی تھی جس سے دونوں زبانوں کے ادبی رشتے مستحکم ہوئے۔انہوں نے کہا کہ ۱۹ ویں صدی کا نصف اول غالب کا دور ہے جو مسلمانوں کی سیاسی شکست وریخت کا بھی زمانہ ہے۔انہوں نے کہا کہ اس کے باوجود عہد غالب کا فارسی ادب کیفیت وکمیت کے لحاظ سے کسی بھی طرح کم اہم نہیں ہے۔ ایک دوسرے مقالہ بعنوان' کلام غالب میں فارسی روایات' میں ڈاکٹر یونس جعفری نے کہا کہ مرزا غالب ترکی النسل تھے اور انہیں اپنے ترک ہونے پر ناز تھا چنانچہ انہوں نے اپنی شاعری میں اپنے اسلاف کی فارسی روایات کو برقرار رکھا۔ڈاکٹر جعفری نے غالب کے اردو دیوان کے پہلے شعر ؎ 'نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا' ،کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس شعر میں غالب کی اسلاف پرستی کی عکاسی ہوتی ہے۔

اس سے قبل پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے 'عہد غالب کی نثر' کے موضوع پر اظہار خیال

کرتے ہوئے کہا کہ غالب سے پہلے بھی نثر لکھی جارہی تھی اس لئے یہ خیال غلط ہے کہ غالب سے اردو نثر کا آغاز ہوتا ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ غالب نے سادہ اور آسان نثر لکھی اور ان کا اسلوب بھی سب سے منفرد تھا جس میں اس زمانے کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی حالات کا عکس نمایاں نظر آتا ہے۔انہوں نے کہا کہ پرنٹنگ پریس کی آمد نے ادبی میدان میں انقلاب برپا کردیا جس نے کتابوں تک رسائی کو آسان بنادیا۔ان کے علاوہ ڈاکٹر جاوید رحمانی نے 'غالب کا پہلا سوانح نگار' کے موضوع پر، پروفیسر قاضی جمال حسین نے 'غالب کی پیش روروایت' ڈاکٹر مظہر مہدی نے انگریزی زبان میں 'عہد غالب کا فکری ماحول' اور پرفیسر قاضی افضال حسین نے 'نئے اسالیب اظہار کا عہد' کے عنوانات پر وقیع مقالات پیش کئے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری اور ڈاکٹر ضمیر حسن دہلوی کی صدارت میں سیمینار کی دوسری مجلس میں ڈاکٹر سید ضمیر حسن دہلوی نے 'غالب کی دلی' الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر احمد علی فاطمی نے 'غالب اور سیکولرزم'، ڈاکٹر خالد جاوید نے 'غالب کا فکری ماحول ،قومی اور بین الاقوامی سطح' اور فاروق ارگلی نے 'غالب اپنے ہم عصروں کی نظر میں' کے موضوعات پر اپنے مقالوں میں روشنی ڈالی۔

اس موقع پر غالب اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا یہ سیمینار مرزا غالب کے ۱۴۳ ویں یوم وفات اور اکیڈمی کے ۴۳ ویں یوم تاسیس کی مناسبت سے منعقد کیا گیا ہے جس کا مقصد غالب شناسی کے نئے نئے پہلوؤں کو اہل ملک اور اہل ذوق کے سامنے لانا ہے۔انہوں نے کہا کہ اکیڈمی کے قیام کا مقصد ہی غالب شناسی کو فروغ دینا ہے جو ابتک اس حوالے سے سینکڑوں سیمینار کرچکی ہے۔سیمینار میں ادیبوں اور اہل علم کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی جو غالب کی مقبولیت کی عکاس ہے۔پہلے اجلاس کی نظامت ڈاکٹر ممتاز عالم رضوی اور دوسرے اجلاس کی نظامت ابوظہیر ربانی نے کی۔اس موقع پر کمپیوٹر کورس کے کامیاب طلباء وطالبات کو اسناد پیش کئے گئے۔ان امتحانات میں اخد نجم اور شمیم نے اول پوزیشن حاصل کی جبکہ فرزینہ نے دوم اور فائزہ نے سوم پوزیشن حاصل کی۔

پروگرام رپورٹ: 20/فروری 2012 محفل کلام غالب:

غالب اکیڈمی کے 43ویں یوم تاسیس اور مرزا غالب کے 143ویں یوم وفات کی مناسبت سے سہ روزہ پروگرام کے تحت 20/فروری 2012 کو غالب اکیڈمی نئی دہلی میں محفل کلام غالب میں مشہور معروف گلوکار انیتا سنگھوی نے غالب کا کلام پیش کیا۔ سارنگی پر آصف علی، ہارمونیم پر سلامت علی اور طبلے پر سلیم احمد نے ساتھ دیا۔ انیتا سنگھوی نے غالب کی غزلوں کے ساتھ ساتھ امیر خسرو کا کلام دو گھنٹے تک پیش کیا۔ اس موقع پر پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ غالب نے اپنی غزلوں کے راگ بھی طے کئے تھے اور اپنے ایک خط میں اس کا اظہار کیا تھا کہ میری غزل راگ جھنجھوٹی میں گائی جائے۔ غالب کو موسیقی کا گہرا علم تھا۔ اس موقع پر بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے جن میں پروفیسر شریف حسین قاسمی، صبا حنفی، نسیم احمد عباسی، ڈاکٹر جگتیانی، انجم عثمانی، ظہیر احمد برنی، حسن ضیا، ایم سلیم، سکندر عاقل، مسز زبیر رضوی، جاوید نسیم، قاضی ارشاد حسین، پنیت کمار، ہدایت الاسلام، فضل بن اخلاق، یامین قریشی، قیصر عزیز، نشتر امروہوی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ متین امروہوی نے اپنے قطع سے انیتا سنگھوی کا استقبال کیا۔

پروگرام رپورٹ: 22/فروری 2012 طرحی مشاعرہ:

مرزا اسداللہ خاں غالب کے 143ویں یوم وفات اور غالب اکیڈمی کے 43ویں یوم تاسیس کی مناسبت سے 22/فروری 2012 کو غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں ایک طرحی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ غالب سے منسوب غالب اکیڈمی سب سے قدیم ادارہ ہے۔ غالب اکیڈمی کے بانی حکیم عبدالحمیدؒ نے 1935 میں غالب کے مزار کے پاس زمین خریدی تھی اس سے پہلے اس کی سرگرمیاں لال کنواں، دہلی میں ہوا کرتی تھیں۔ غالب صدی کے موقع پر 22/فروری 1969 کو اکیڈمی کا افتتاح ہوا تو اس موقع پر باقاعدہ جلسے ہونے لگے کئی برسوں سے اکیڈمی نے اپنی سرگرمیوں میں اضافہ کیا اور طرحی مشاعرہ بھی شروع کیا جو بہت مقبول

ہوگیا ہے۔ مشاعرے کی صدارت جناب گلزار دہلوی نے کی ۔معین شاداب نے مشاعرے کی نظامت کی۔ مشاعرہ کی شمع جناب گلزار دہلوی اور پروفیسر شمیم حنفی نے روشن کی۔ بتیس شعرا نے غالب کی طرح ''دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں'' اور ''رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو'' میں اپنے اشعار سنائے۔

پوچھیے دل سے عشق میں ایسے قدم اٹھائے کیوں　خود ہے بنائے درد دل کرتا ہے ہائے ہائے کیوں　متین امروہوی

راز داری کا اگر مفہوم ہے افشائے راز　پھر تو اچھا ہے کہ اپنا رازداں کوئی نہ ہو　اسرار احمد

نارسائی ذہن کی ہو اور گماں کوئی نہ ہو　کیا عجب ہے رسم وراہ دوستاں کوئی نہ ہو　عمران عظیم

بزدلوں سے چھین لی جاتی ہے اکثر سلطنت　ملک کوئی بھی ہو بزدل حکمراں کوئی نہ ہو　شریف شہباز

رقص میں مصروف سورج سائباں کوئی نہ ہو　پھر تری زلفوں سے بہتر آشیاں کوئی نہ ہو　ایس۔یو۔ظفر

زندگی اب جی رہا ہوں اس طرح تیرے بغیر　دھوپ کے لمبے سفر میں سائباں کوئی نہ ہو　جاوید قمر

کوچہ جاناں میں جس سے سابقہ ہم کو پڑا　سخت ایسا زندگی میں امتحاں کوئی نہ ہو　احمد علی برقی

اے خدا اپنی نوازش سے مجھے کر سرفراز　اپنی منزل آپ پالوں مہرباں کوئی نہ ہو　ممتا کرن

میں رہوں تنہا خود اپنی ذات میں جلوہ فگن　میہماں کوئی نہ اور میزباں کوئی نہ ہو　سکندر عاقل

اک طرف تو ڈول بانٹے جا رہے ہیں ہر طرف　اک طرف یہ حکم بستی میں کنواں کوئی نہ ہو　معین شاداب

سایہ بن کر آپ آئے زندگی میں شکریہ　وہ زمیں تھی ایسی جس کا آسماں کوئی نہ ہو　انا دہلوی

جب زبانِ اشک باری سے ہو تجھ سے گفتگو　اے خدائے لم یزل پھر درمیاں کوئی نہ ہو　شمس رمزی

دل کو ہزار راستے دل تری سمت جائے کیوں　گر نہیں تجھ کو یاد ہم تو ہمیں یاد آئے کیوں　احمد محفوظ

جتنی تھیں آسانیاں شاہین اب ہیں مشکلیں　ہو چکے سب امتحاں اب امتحاں کوئی نہ ہو　سلمیٰ شاہین

چاہتے ہیں آج کی جمہوریت کے پاسباں　بیچ میں بتیس دانتوں کے زباں کوئی نہ ہو　تابش مہدی

مشغلہ کوئی چاہیے ہجر ہو یا وصال ہو　عمر گزر ہی جائے گی کیجیے ہائے ہائے کیوں　شہباز ندیم ضیائی

کاش مل جائے بصارت رہبران قوم کو　تاکہ منزل سے بھٹکتا کارواں کوئی نہ ہو　اسد رضا

آئینہ دار آگہی دیکھیے ان کی سادگی　ڈوبے ہیں اس خیال میں اپنے ہوئے پرائے کیوں　ظفر مرادآبادی

دوریاں کچھ بھی نہیں ہیں اس کے میرے درمیاں　شرط یہ ہے اس کے میرے درمیاں کوئی نہ ہو　قاسم میاں نیازی

جب ہو شعور تشنہ لب منزل حق کی ہو طلب　پائے ثبات ناز پر میری نظر نہ جائے کیوں　ابرار کرت پوری

درس دیتے ہیں نئی اونچائیاں سر کرنے کا　چاہتے یہ ہیں جہاں وہ ہیں وہاں کوئی نہ ہو　شہپر رسول

ہو جو بسر ہنسی خوشی اصل میں وہ ہے زندگی　بوجھ بنے جو زندگی کوئی اسے اٹھائے کیوں　وقار مانوی

حیف دلی مٹ چکی وہ اہل دلی اب کہاں　ذکر بھی پھر ان کا میرے مہرباں کوئی نہ ہو　گلزار دہلوی

مالک کل! ہم گنہگاروں کی ہیں سب رونقیں　وہ بھی کیا دنیا سوا تیرے جہاں کوئی نہ ہو　نسیم عباسی

مسئلہ کتنا ہی پیچیدہ ہو حل ہو جائے گا　شرط یہ ہے اس کے میرے درمیاں کوئی نہ ہو　سلیم صدیقی

آخر میں غالب اکیڈمی کے صدر پروفیسر شمیم حنفی نے شعرا اور سامعین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ بقول فراق جس نے غالب کی تقلید کی اس نے اپنا بھی کھو دیا لیکن اس مشاعرے میں سب نے غالب کی زمین میں اپنی طرز پر شعر نکالے جو قابل مبارکباد ہے۔ مشاعرے میں بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے۔

OO

غالب اکیڈمی میں ایم سلیم کے انتقال پر ملال پر تعزیتی میٹنگ

غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی میں اردو کی سرگرم اور فعال شخصیت ایم سلیم کے انتقال پر ملال پر ایک تعزیتی میٹنگ ہوئی اس موقع پر ڈاکٹرعقیل احمد نے کہا کہ ایم سلیم نے مولانا محمد علی جوہر اکیڈمی کے ذریعے اردو کی عدیم المثال خدمت کی ہے۔ غالب اکیڈمی میں ہر سال مولانا محمد علی جوہر کے یوم ولادت 10 دسمبر اور 4 جنوری کو مولانا کے یوم وفات کی مناسبت سے پروگرام کا انعقاد کرتے تھے۔ یہ سلسلہ گزشتہ بائیس سال سے جاری ہے۔ پہلا جلسہ 10 دسمبر 1989 کو غالب اکیڈمی میں سابق صدر جمہوریہ جناب گیانی ذیل سنگھ کی سرپرستی میں ہوا تھا جس میں لوگوں کی تعداد بہت کم تھی لیکن گیانی جی کی حوصلہ افزائی سے ایم سلیم مسلسل جدوجہد کرکے بڑے شاندار پروگرام منعقد کرتے رہے۔ 3 اپریل 2012 کو انھوں نے ڈاکٹر یعقوب قریشی کے نام ایک شام کا انعقاد کیا تھا۔ ایم سلیم کی خدمات کو اردو والے بھول نہیں سکیں گے۔ ان کے انتقال سے اہل اردو نے ایک فعال شخصیت کو کھو دیا ہے۔ اس موقع پر فضل بن اخلاق نے کہا کہ ایم سلیم صاحب بڑی محنت سے پررونق محفل سجاتے تھے۔ متین امروہوی نے کہا ایم سلیم مرحوم کا انتقال پر ملال ایک ایسا سانحہ ہے جس کو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا وہ اردو زبان کے سچے خادم اور مجاہد تھے اور حضرت مولانا محمد علی جوہر کے عاشق اور عقیدت مند تھے۔ مجھے ان کے اٹھ جانے کا بڑا افسوس ہے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ اسی موقع پر نسیم عباسی نے کہا کہ ایم سلیم جیسے لوگ جو اپنے بزرگوں کی یاد میں جلسے کرتے ہیں۔ لوگوں کی خدمات کو سراہتے ہیں۔ ان کو اعزازات سے نوازتے ہیں۔ بڑے قابل قدر ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا اٹھ جانا افسوسناک ہے۔ میں بارگاہ خداوندی میں دست بدعا ہوں کہ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ جناب ریاض قدوائی نے کہا کہ ایم سلیم ایک بیباک صحافی تھے۔ طویل عرصے تک اپنے اخبار پیغام چمن کے ذریعے وہ مقامی اور ملک گیر مسائل کو اٹھاتے رہے ان مسائل پر سمجھوتہ کرنے کے بجائے وسائل کی کمی کے باعث اخبار بند کرنے کو ترجیح دی۔ مرحوم کے توسط سے مولانا محمد علی جوہر کی لاتعداد صفات عام لوگوں کے علم میں آئیں۔ میٹنگ کی صدارت ہندی کے مشہور صحافی کنور نریندر سنگھ نے کی۔

○○

ڈاکٹر عقیل احمد

کتابوں کی باتیں

کتاب کا نام: پس اشک

شاعر کا نام: شہباز ندیم ضیائی

محمد فاروق انصاری جو شہباز ندیم ضیائی کے نام سے دہلی کی ادبی اور ثقافتی زندگی کا ایک جاندار کردار ہیں۔ محفلوں میں خلوص نیت کے ساتھ شرکت کرتے ہیں چھ مجموعے ایک نعتیہ اور پانچ غزل کے مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ پس اشک ان کا ساتواں مجموعہ ہے۔ جو 58 نظموں پر مشتمل ہے۔ جس میں ایک طویل نظم فطرت سے دریوزۂ کائنات شامل ہے جس میں دنیا کے مختلف کرداروں کے متعلق شاعر نے اپنی فکر کا اظہار کیا ہے۔ اس نظم کے 12 ذیلی عنوانات ہیں جو کسی ایک کردار پر مبنی ہیں۔ شہنشاہ، رئیس زادوں۔ مغنیہ، سپاہی، فنکار، نقاش، رقاصہ، مصائب، شاعر، عورت، صوفی دوست یہ سب اپنا تعارف کراتے ہیں اور آخر میں یہ دوہراتے ہیں عزت دولت عشرت وراحت سے ہوں لیکن محروم، کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا۔ 12 کردار سماج کے خوش حال ہی نہیں برسر اقتدار اور سماجی اعتبار سے اپنے اپنے شعبہ کے کاملین میں سے ہیں لیکن سب کے یہاں دنیا کی عشرت وراحت کا گلہ ملتا ہے بقول جاں نثار اختر۔

ہر ایک روح میں اک غم چھپا لگے ہے مجھے یہ زندگی تو کوئی بددعا لگے ہے مجھے

شاعر نے بڑی فن کاری سے نظم کو ڈرامائی رنگ عطا کیا ہے۔ لیکن بعض کردار عہد ماضی کی یاد ہیں۔ حال سے ان کا کوئی استعاراتی ربط پیدا نہیں ہو سکا۔

اس مجموعہ کا آغاز حمد سے ہوتا ہے اس میں شاعر بہت سادگی سے خدا کی عظمت بیان کرتے ہوئے خدا اور خود سے ربط پیدا کرتا ہے خدا نور کا سائبان ہے اسی کے اشارے پر چاند تارے اور سورج طلوع وغروب ہوتے ہیں۔ نظم کا ابتدائی حصہ:

خدائے برتر

زمین ہم، آسمان ہے تو

کہ نور کا سائبان ہے تو
عظیم ہے تو مہان ہے تو
ترے اشارے پہ ڈوبتا ہے
ترے اشارے ہی پہ ابھرتا ہے
مہر تاباں
غروب ہوتے ہیں
نیلگوں آسماں کے تار
طلوع ہوتا ہے
چاند کا پرکشش نظارہ

شہباز ندیم ضیائی نے نظموں کے مقابلے غزلیں زیادہ کہی ہیں۔غزلوں کی وجہ سے وہ شاعروں کے کامیاب شاعر ہیں۔نظم اور غزل پر اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے شہباز لکھتے ہیں۔

''غزل دراصل اختصار یعنی کوزے میں سمندر سمونے کا ہنر ہے جب کہ نظم میں وسعت پذیری کی گنجائش موجود ہیں لیکن نظموں کی تخلیق کے دوران مجھے محسوس ہوا کہ نظم غزل کے مقابلے زیادہ ارتکاز و یکسوئی کی متقاضی ہوتی ہے غزل کی اشیا سے نظم کی حسن کاری اسے پرکشش بھی بناتی ہے اور صوتی و معنوی پرتو کے تنوع کی ضامن بھی ہوتی ہے۔''

شہباز کی نظموں پر غزل کا خاصا اثر ہے۔یہ کم و بیش چالیس سال سے شاعری کر رہے ہیں۔غزلوں کے ساتھ ساتھ نظمیں بھی لکھتے رہے ہیں۔نظموں میں سماجی زندگی کو بیان کرنے کی گنجائش زیادہ ہوتی ہے اس کا انھوں نے فائدہ اٹھایا ہے۔اپنی ایک نظم مسیحا بن جاؤ میں نہایت جرأت مندی سے عصر حاضر کے جواں فنکاروں کو مخاطب کر کے زخم خوردہ بشریت کا مسیحا بننے کی دعوت دیتے ہیں۔پس اشک کا مطالعہ ادبی و شعری ذوق رکھنے والوں کے لیے نہایت مفید ہے۔

OO

○○

مطبوعات غالب اکیڈمی

نام کتاب	مصنف/مترجم	قیمت
دیوانِ غالب (ہندی)		100/-
دیوانِ غالب عام ایڈیشن	غالب اکیڈمی	60/-
یادگار غالب فارسی متن کے ترجمے	الطاف حسین حالی	450/-
دیوان غالب ڈیلکس		200/-
شرح دیوان غالب اردو	قاضی سعید الدین علیگ	250/-
اقبال کی منتخب نظمیں غزلیں تنقیدی مطالعہ	پروفیسر اسلوب احمد انصاری	150/-
تفتہ اور غالب	ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری	35/-
شرح دیوان غالب (ہندی)	نسیم احمد عباسی	550/-
غالب اور فن تنقید	اخلاق حسین عارف	25/-
تصورات غالب	محمد عزیز حسن	35/-
انشائے مومن	پروفیسر ظہیر احمد صدیقی	25/-
مومن شخصیت اور فن	پروفیسر ظہیر احمد صدیقی	300/-
ہندوستانی رنگ	پروفیسر محمد حسن	75/-
نوائے سروش (انگریزی)	غالب اکیڈمی	40/-
اقبال/مضامین مقالات	پروفیسر اسلوب احمد انصاری	95/-
جنوب مغرب ایشیا میں رابطے کی زبان	پروفیسر محمد حسن	75/-
رقص شرر	ان میری شمل (قاضی افضال حسین)	90/-
اردو غزل کے اہم موڑ	شمس الرحمان فاروقی	150/-
تلمیحات غالب	محمود نیازی	90/-
جہات غالب	ڈاکٹر عقیل احمد	200/-
حکیم عبدالحمید شخصیت اور خدمات	ڈاکٹر عقیل احمد	150/-
مطالعات خطوط غالب	حکیم عبدالحمید	150/-
مطالعات کلام غالب	حکیم عبدالحمید	600/-
نشاط غالب	وجاہت علی سندیلوی	150/-
اقبال اور عصر حاضر کا خرابہ	پروفیسر شمیم حنفی	150/-